دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

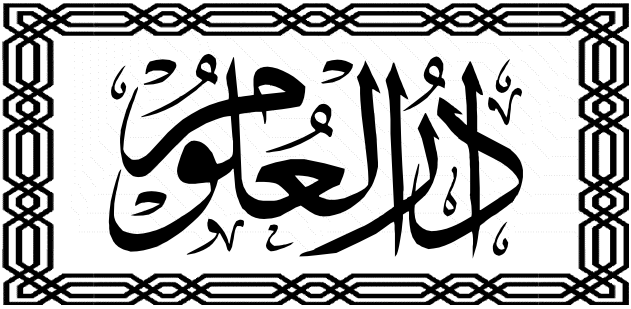

جلد: ۹۸	رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ مطابق جولائی ۲۰۱۴ء	شمارہ: ۷

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۲۰ روپئے، سالانہ -/۲۰۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۱۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Abul-Qasim Numani,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بوڑھوں اور حیوانات کے ساتھ آپ ﷺ کا کریمانہ سلوک	مولانا محمد مجیب الرحمٰن دیودرگی	۶
۳	مدارس میں زکوٰۃ کی فراہمی اور طریقۂ استعمال	مفتی اشتیاق احمد قاسمی	۱۵
۴	دنیا فانی اور آخرت باقی	مولانا محمد ضمیر رشیدی	۲۳
۵	غیروں کی طرف سے اسلام کی نئی فتنہ انگیز تشریحات	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۲۶
۶	دارالعلوم دیوبند تجدید دین کی عالم گیر تحریک	مولانا محمد اللہ قاسمی	۳۰
۷	عالمِ عربی کے معروف عالم شیخ البانیؒ....	مولانا محمد یاسر عبداللہ	۴۰
۸	تعارف وتبصرہ	اشتیاق احمد قاسمی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

ہرقوم اور ملت کا اپنا ایک مخصوص معاشرتی نظام اور اپنی ایک منفرد تہذیب ہوتی ہے۔جس کے ذریعہ اس کی قومی شناخت اور ملّی تشخص قائم رہتا ہے۔اور اس کا معاشرہ شکست وریخت اور دوسری تہذیبوں میں جذب ہونے سے محفوظ رہتا ہے؛ البتہ دیگر اقوام ومذاہب کے معاشرتی آئین بالعموم خود ان کے اپنے وضع کردہ عادات اور رسوم پر مشتمل ہوتے ہیں، جن کا مذہب سے تعلق برائے نام ہوتا ہے؛ جب کہ مسلمانوں کا یہ غیر متزلزل عقیدہ ہے کہ عبادت ومعاملات وغیرہ کی طرح اسلامی نظامِ معاشرت بھی اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ خدا اور رسولِ خدا ﷺ کے ارشادات وہدایات پر مبنی ہیں؛ اس لیے کہ اسلام میں قانون سازی کا حق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔زندگی کے تمام شعبوں میں خدائے واحد ہی کے احکام وقوانین کی عملداری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا صاف اعلان ہے: ''أَلَالَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ ربُّ العٰلمين'' (اعراف) یادرکھو! اللہ ہی کے لیے خاص ہے، خالق ہونا، اور حاکم ہونا، بڑی خوبیوں والے ہیں اللہ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

اس سلسلے میں اپنے رسول کو یہ ہدایت دی ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِنَ الأمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (جاثیه)

پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کردیا؛ لہٰذا آپ اسی طریقہ پر چلیں اور ان جہلا کی خواہشوں پر نہ چلیں۔

قانون الٰہی کے اساسی مجموعہ، قرآن کے مقصدِ نزول کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ (نساء)

بیشک ہم نے آپ کے پاس یہ قرآن بھیجا ہے واقع کے موافق؛ تاکہ آپ اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو بتایا ہے۔

احکامِ خداوندی کو نظر انداز کرنے والوں کی مذمت ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ)

اور جو لوگ اللہ کے بتائے ہوئے احکام وقوانین کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

ان آیاتِ قرآنیہ سے حسبِ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) تشریع اور قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے (۲) نبی کریم ﷺ ان قوانین کا نفاذ فرماتے ہیں (۳) خدا کے مقرر کردہ احکام میں کسی کو تغیر وتبدل کا حق واختیار نہیں ہے۔ ایسا کرنے والے اللہ کے نزدیک منکر، ستم گار اور نافرمان ہیں۔

اسلام کا یہ نقطۂ نظر اتنا واضح اور روشن ہے کہ مستشرقین بھی اس سے چشم پوشی نہیں کرسکے اور انھیں اس کا اعتراف کرنا پڑا؛ چنانچہ مشہور مستشرق ''کولسن'' اقرار کرتا ہے کہ اسلام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد قانون ساز ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسی کے احکام کا غلبہ ہے۔'' (اے ہسٹری آف اسلامک لا، کولسن ص ۱۲۰)

فیز جیرالڈ بھی اسے تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا وہ لکھتا ہے: ''اسلام اللہ تعالیٰ کو واحد قانون ساز و صاحبِ تشریع قرار دیتا ہے اور اس سلسلہ میں کسی کو بھی اس کا شریک نہیں گردانتا'' (دی الیجڈ ڈف آف اسلامک ٹورومن، فیز جیرالڈ ص ۸۲ ج ۶۸)

گوائے ٹائن مستشرق کو بھی اعتراف ہے کہ دقیق قانونی معاملات میں بھی دین سے مربوط ہیں؛ بلکہ وہ وحی الٰہی کا ناقابلِ تقسیم حصہ ہیں، شریعت ایسے عصری تقاضوں کا مجموعہ نہیں ہے جو قرآن اور نبی ﷺ کے بعد مرتب ہوئے ہوں؛ بلکہ اسلامی معاشرہ میں ان کا باضابطہ نفاذ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں کیا۔'' (اسٹڈیز اِن اسلامک ہسٹری، گوائے ٹائن ص ۱۲۹)

آیئے اب دستورِ ہند پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں اور دیکھیں کہ سیکولر ہندوستان میں بسنے والی اکائیوں کو وہ کیا حقوق دیتا ہے اس سلسلہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ دستور کی دفعہ (۲۵) میں یہاں کے ہر شہری کو کسی بھی مذہب کو قبول کرنے، اس پر قائم رہنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ اور پرچار کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ دفعہ (۲۶) کی رو سے مسلمانانِ ہند جداگانہ ایک مذہبی گروہ قرار

پاتے ہیں اور انھیں اپنے مذہبی امور کے منظّم کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ دفعہ (۲۹) مسلمانوں کو اپنے کلچر، زبان اور رسم الخط کے تحفظ کا حق اور اختیار دیتی ہے۔ دفعہ (۳۰) کے تحت انھیں تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظام سنبھالنے کا حق ملتا ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمان اپنی کمیونٹی اور انفرادیت کی بقا اور جداگانہ شناخت کے لیے جن عناصر کو تسلیم کرتے ہیں، وہ ان کا عالم گیر مذہب، ان کی چودہ سو سالہ قدیم تہذیب اور مخصوص معاشرتی اقدار ہیں؛ جنھیں آئینِ ہند کا طاقتور تحفظ بھی حاصل ہے؛ اس لیے یکساں سول کوڈ کا نعرہ بلند کرنے والے نہ صرف مسلمانوں کے مذہب میں بیجا مداخلت کرتے ہیں؛ بلکہ آئینِ ہند کے بنیادی کردار کا بھی مضحکہ اڑاتے ہیں؛ اس لیے یہ لوگ قطعی طور پر ملک اور اس کے آئین کے وفادار نہیں ہیں؛ اس لیے لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) کیا اس نظریہ کو پیش کرنے والے آئینِ ہند کے حق میں وفادار ہیں؟

(۲) یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے بعد ہندوستان کی سیکولر حیثیت محفوظ رہ جائے گی؟

(۳) کیا اس عظیم ملک میں جہاں مختلف مذہب، مختلف تہذیب و معاشرت کے لوگ رہتے ہیں یکساں کوڈ کا نفاذ ملک میں انتشار اور خانہ جنگی کا سبب نہیں بنے گا؟

(۴) کیا مسلمان! مسلمان رہتے ہوئے اس نظریہ کو قبول کر سکتے ہیں؟

(۵) کیا اس نظریہ کو قبول کر لینے اور اپنی زندگی میں نافذ کر لینے کے بعد مسلمانوں کی علاحدہ شناخت اور ان کا ملی تشخص باقی رہے گا؟

(۶) پھر یہ سول کوڈ کیا ہوگا، اور ملک کے مختلف مذاہب میں کس مذہب سے اخذ کر کے سب کو اس پر قانوناً مجبور کیا جائے گا، اس کی وضاحت ضروری ہے، اس کے بغیر یکساں سول کوڈ کا شوشہ چھوڑنا مجذوب کی بڑ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا، شاید اس لیے پہلے یہ طے ہو جانا ضروری ہے اور ظاہر ہے اس کا طے کرنا جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے اور اس سے مشکل تر ملک میں موجود سارے اہلِ مذاہب کا اسے قبول کر لینا ہے۔

امید ہے کہ ان سوالات پر علمائے امّت، دانشورانِ قوم اور ملکی و سیاسی رہنما بالخصوص حکومت میں موجود دخیل اصحابِ فکر ورائے ہر قسم کے سیاسی، مذہبی اور قومی تعصب اور جنبہ داری سے بلند ہو کر بالغ نظری کے ساتھ غور و خوص کر کے کوئی صحیح فیصلہ کریں گے۔

❁ ❁ ❁

بوڑھوں اور حیوانات کے ساتھ آپ ﷺ کا کریمانہ سلوک

از: مولانا مجیب الرحمٰن دیودرگی
استاذ دارالعلوم حیدرآباد

اُداس چہرہ، سفید ڈاڑھی، ہاتھ میں لاٹھی، کھال میں سِلوٹ، چال میں سستی، بات میں لرزہ، یہ معاشرہ کا وہ کمزور طبقہ ہے، جسے ہم ''بوڑھا'' کہتے ہیں، انسانی زندگی کئی مراحل سے گزرتے ہوئے بڑھاپے کو پہونچتی ہے، بڑھاپا گویا اختتامِ زندگی کا پروانہ ہے، اختتامی مراحل ہنسی خوشی پورے ہوں تو اس سے دلی تسلی بھی ہوتی ہے، رہن سہن میں دشواری بھی نہیں؛ لیکن آج جوصورتحال سن رسیدہ افراد کے ساتھ روا رکھی گئی ہے، اس سے عمر رسیدہ افراد کی پریشانی میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے؛ حالانکہ والدنے بچے کی پرورش اس امید پر کی تھی کہ وہ بڑھاپے میں سہارا بنے گا، بجائے اس کے کہ یہ لڑکا بوڑھے باپ کو سہارا دیتا، کمر کو بھی توڑ دیتا ہے۔ایک جانب معاشرہ کی یہ صورتحال ہے، دوسری جانب نبیِ اکرم ﷺ کا اسوہ کہ آپ ﷺ نے بوڑھوں کے ساتھ کمزوروں کے ساتھ ضعیفوں کے ساتھ بہت ہی زیادہ حسنِ سلوک کا مظاہر کیا، جہاں آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ عمر رسیدہ افراد کی قدردانی کی تعلیم دی، وہیں آپ ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعہ قدردانی کا ثبوت بھی مہیا فرمایا، آپ ﷺ نے سن رسیدہ افراد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی کا تقاضہ یہ ہے کہ بوڑھے مسلمان کا اکرام کیا جائے (ابوداؤد: ۴۸۴۳ باب فی تنزیل الناس منازلہم، حسن) ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے بال اسلام کی حالت میں سفید ہوئے ہوں، اس کے لیے قیامت کے دن نور ہوگا (ترمذی: ۱۶۳۴ باب ماجاء فی فضل من شاب، صحیح) ان احادیث سے سن رسیدہ افراد کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اول الذکر میں آپ ﷺ نے عمر رسیدہ کو حاملِ قرآن و عادل بادشاہ پر بھی مقدم کیا ہے؛ حالانکہ ان

دونوں کی اہمیت وعظمت اپنی جگہ پر مسلم ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے بوڑھوں کی رعایت کرتے ہوئے، ان کی حمایت فرمائی، دوسری حدیث میں بڑھاپے کے اثرات کا اخروی فائدہ بیان کیا کہ جس پر بڑھاپا اسلام کی حالت میں آیا ہو تو اس کے لیے اللہ اس بڑھاپے کی قدردانی کرتے ہوئے روزِ محشر نور مقدر فرمائیں گے، آپ ﷺ نے بوڑھوں کا اکرام واحترام کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا: چھوٹا بڑے کو سلام کرے، (بخاری: ۶۲۳۴ باب تسلیم الصغیر علی الکبیر) بڑوں کے اکرام واحترام کی ایک شکل سلام بھی ہے، بڑوں کی عمر ان کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے چھوٹے ہی بڑوں کو سلام کیا کریں؛ تاکہ یہ سلام چھوٹوں کی جانب سے بڑوں کے اکرام کا جذبہ بھی ظاہر کرے، اور بڑوں کے لیے بھی دل بستگی کا سامان ہو، کئی مقامات پر بڑوں کو بچوں سے اسی بات کی شکایت ہوتی ہے کہ بچے انھیں سلام نہیں کرتے، فطری طور پر بڑے عزت کے طالب ہوتے ہیں، کیوں نہ ہم ان کے اس تقاضے کا لحاظ کرتے ہوئے سلام کے ذریعہ ان کے جی کو خوش کریں، مجالس میں کوئی مشروب آئے تو اس میں آپ ﷺ نے اس بات کا لحاظ کیا اس کو اولاً بڑے نوش فرمائیں، بڑوں سے آغاز ہو، فرمایا: بڑوں سے آغاز کرو؛ بلکہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ مسواک کرتے ہوئے دو میں سے بڑے کو پہلے مسواک عنایت فرمائی (ابوداؤد: ۵۰ باب فی الرجل یستاک، صحیح) نیز آپ ﷺ نے بڑوں کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے فرمایا: اَلْبَرَکَۃُ مَعَ أَکَابِرِکُمْ کہ برکت تو تمہارے بڑوں کے ساتھ ہے، کون ہے جو برکت کا متلاشی نہ ہو؟ کون ہے جو برکت کا طلبگار نہ ہو؟ آج تو کئی ایک بے برکتی کے شاکی ہیں، ایسے میں برکت کے حصول کا آسان طریقہ کار یہ ہے کہ بوڑھوں کو اپنے ساتھ رکھا جائے، ان کے اخراجات کی کفالت کی جائے، اس سے آمدنی میں برکت ہوگی، نیز ایک موقع پر فرمایا: بات چیت میں بھی بڑوں کو موقع دیا، کَبِّرِ الکِبَرَ، اس کی تشریح کرتے ہوئے یحییٰؒ نے فرمایا: بات چیت کا آغاز بڑے لوگوں سے ہو، (بخاری: ۶۱۴۲ باب اکرام الکبیر) ایک موقع پر بوڑھوں کے اکرام کے فضائل وفوائد ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: جس نوجوان نے کسی بوڑھے کا اکرام اس کی عمر کی بنیاد پر کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بڑھاپے میں اکرام کرنے والا شخص مقرر فرمائیں گے (ترمذی: ۲۰۲۲ باب ما جاء فی اجلال الکبیر، ضعیف) کون ہے جو اپنے بڑھاپے کو ہنسی خوشی پورا نہیں کرنا چاہتا؟ کون ہے جو بڑھاپے میں خدمت گزاروں سے کتراتا ہے؟ کون ہے جو بڑھاپے میں آرام وسکون نہیں چاہتا؟ ان سب کے لیے آپ ﷺ نے ایک آسان نسخہ عنایت فرمایا کہ اپنے بوڑھوں کا اکرام کرو تمہیں بڑھاپے میں

خدمت گار مل جائیں گے، الغرض! مختلف مواقع پر مختلف انداز سے آپ ﷺ نے بوڑھوں کی اہمیت وعظمت کو واضح کیا، اور امت کو ان پر توجہ کی تعلیم دی، یہ آپ ﷺ کے کریمانہ اخلاق ہیں کہ امت کے ہر کمزور طبقہ پر بذاتِ خود بھی رحم وکرم کا معاملہ کیا، اوروں کو بھی رحم وکرم سے پیش آنے کی تلقین کی۔

بڑوں کے ساتھ آپ ﷺ کا طرزِ عمل

ایک سن رسیدہ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے، آنے والے کے لیے لوگوں نے مجلس میں گنجائش نہ پیدا کی، آپ ﷺ نے اس صورتحال کو دیکھ کر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہوکر فرمایا: جو شخص چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، بڑوں کی عزت نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں (ترمذی: ۱۹۱۹ باب ماجاء فی رحمۃ الصغیر) یعنی ایک مسلمان میں جو صفات ہونی چاہیے ان میں سے ایک بڑوں کا اکرام بھی ہے، اگر کوئی اس وصف سے متصف نہیں تو گویا وہ ایک اہم مسلمانی صفت سے محروم ہے، اگر کوئی اس اہم اسلامی صفت کا خواستگار ہے تو اسے بڑوں کے اکرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، فتحِ مکہ کے بعد جو حیرت انگیز واقعات رونما ہوئے انھیں میں ایک اہم واقعہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بوڑھے والد کا بھی پیش آیا، لوگوں نے آپ ﷺ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرنے کے لیے انھیں آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر کیا، آپ ﷺ نے ان کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے فرمایا: ان کو گھر ہی میں کیوں نہ چھوڑا؟ میں خود ان کے گھر پہونچ جاتا (مستدرک حاکم: ۵۰۶۵ ذکر مناقب ابی قحافہ)

واضح رہے آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں فاتح بن کر داخل ہورہے ہیں، اس کے باوجود بوڑھوں کے ساتھ آپ ﷺ کا یہ رحیمانہ وکریمانہ سلوک ہے؛ حالانکہ دیگر فاتحین کا طرزِ عمل تو وہ ہے، جسے قرآن حکیم نے بیان کیا ہے کہ جب فاتحین کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس بستی کو برباد کردیتے ہیں، اہلِ عزت کو ذلیل کرتے ہیں، یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے، (النمل: ۳۴) یہ عمر رسیدہ افراد کی عملی قدردانی ہے، جس کا آپ ﷺ ثبوت فراہم کررہے ہیں، آپ ﷺ نے ان کی تعظیم کرتے ہوئے یہ تصور نہ کیا کہ ابوقحافہ ایک طویل عرصہ تک کفر کی حالت میں رہے، اب کفر مغلوب ہوا تو وہ مسلمان ہورہے ہیں، بعض دفعہ انسان سابقہ اختلاف کی وجہ سے کسی کی تعظیم وتکریم سے کتراتا ہے؛ حالانکہ اس میں ان لوگوں کے لیے اسوہ ہے کہ سن رسیدہ کی بہرصورت تعظیم کی جائے، نماز کے آپ ﷺ

انتہائی حریص اس حرص وطمع کے باوجود بھی بوڑھوں کی رعایت میں نماز میں تخفیف فرمادی، ابو مسعود ﷺ انصاری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صحابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کرنے لگے کہ میں ظہر کی نماز میں فلاں شخص کی طویل قرأت کی وجہ سے حاضر نہیں ہوسکتا، ابومسعود ﷺ کہتے ہیں کہ میں نے اس موقع پر آپ ﷺ کو جس غضبناک کیفیت میں دیکھا اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، پھر آپ ﷺ نے صحابۂ کرام ﷺ سے مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا: نمازیوں میں نماز سے نفرت مت پیدا کرو، لہٰذا جو بھی شخص امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھایا کرے، کیوں کہ اس میں کمزور بھی ہیں، بوڑھے بھی ہیں، ضرورت مند بھی ہیں (بخاری: ۷۰۲ باب إذا طول الامام وکان الرجل ذا حاجۃ) ایک اور موقع پر آپ ﷺ سے طویل قرأت کی شکایت کی گئی تو آپ ﷺ نے حضرت معاذ ﷺ پر غصہ ہوتے ہوئے فرمایا: فَتَّانٌ فَتَّانٌ! (بخاری: ۷۰۱ باب إذا طول الامام) اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنہ میں ڈالنے والے ہو! تین دفعہ آپ ﷺ نے ان کلمات کو دھرایا، غور وخوض کا مقام ہے کہ سن رسیدہ اور کمزور افراد کی رعایت کا سلسلہ نماز جیسے اہم فریضہ میں بھی جاری ہے، بڑھیا کا مشہور واقعہ جس میں آپ ﷺ نے بڑھیا کا سامان اٹھا کر شہر مکہ کے باہر پہونچادیا تھا؛ حالانکہ وہ بڑھیا جو اسلام سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے آپ ﷺ کے خلاف بدزبانی میں مصروف تھی؛ لیکن آپ ﷺ کی خدمت کے طفیل اس بڑھیا نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ ایک دفعہ مجلس میں بائیں جانب اکابر صحابۂ کرام ﷺ تشریف فرما تھے اور دائیں جانب ایک بچہ تھا اور مجلس میں کوئی مشروب پیش ہوا تو آپ ﷺ نے اس بچے سے اجازت چاہی کہ چونکہ تم دائیں جانب ہو اگر تم اجازت دو تو میں اس کا آغاز ان بڑے صحابہ کرام ﷺ سے کروں، اس بچے نے اپنے آپ پر کسی کو ترجیح دینے سے انکار کردیا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ مشروب اسی کے ہاتھ میں تھمادیا، (بخاری: ۲۳۶۶، باب من رأی أن الحوض الخ) غور طلب امر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے بائیں جانب بڑوں کی موجودگی کے باوجود اس بات کی کوشش کی کہ مشروب کا آغاز بڑوں ہی سے ہو، اس کے لیے بچے سے اجازت بھی مانگی؛ لیکن بچے نے آپ ﷺ کے نوش کردہ برکت کی وجہ سے اپنے آپ پر کسی کو ترجیح نہ دی، اس سے بھی بڑوں کے ساتھ اکرام کا درس ملتا ہے کہ بہرصورت ان کے اکرام کی کوشش کی جائے، ان کی توہین سے بیزارگی کا اظہار ہو۔

ان اقوال واحوال کا سرسری جائزہ لینے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ آپ ﷺ نے بوڑھوں کا ہر موقع پر لحاظ فرمایا، کسی بھی بوڑھے کا اکرام آپ ﷺ نے انسانیت کی بنیاد پر کیا،

رشتہ داری وتعلق سے بالاتر ہوکر آپ ﷺ نے ہر سن رسیدہ کے اکرام کو ترجیح دی، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانیت کے اس ستم رسیدہ طبقے کے ساتھ احترام واکرام کا معاملہ کیا جائے، ان کے حقوق جان کر پورے کرنے کی کوشش کریں، کسی چیز کے ذریعہ بڑھاپے میں انھیں تکلیف نہ دیں، ان کی ضروریات پوری کر کے ان پر احسان کرتے ہوئے ان کی دعاؤں میں شامل ہوں، بعض دفعہ بوڑھوں سے ہونے والی خطاؤں سے نظر انداز کریں۔

حیوانات کے ساتھ آپ ﷺ کا رحیمانہ سلوک

اس دور میں جب کہ مسلمانوں کی شبیہ بگاڑ کر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے، مسلمانوں کو مسیحا کے بجائے قاتل، صلح پسند کے بجائے جنگجو، امن پسند کے بجائے شدت پسند کے عنوان سے متعارف کرنے کی پیہم کوشش جاری ہے، دشمنانِ اسلام کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ مسلمان کبھی شدت پسند وجنگجو ہو ہی نہیں سکتا؛ کیونکہ اس کا رشتہ ایسے نبی کریم ﷺ سے ملتا ہے، جو صرف انسانیت ہی کے لیے نہیں؛ بلکہ سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں، جن کی رحمت کا اثر صرف انسانوں تک ہی محدود نہ تھا؛ بلکہ اس سے متجاوز ہوکر آپ کا سایۂ عاطفت ورحمت چرند پرند حیوانات تک کے لیے عام تھا، جہاں آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ جانوروں کے ساتھ نرمی کی ہدایات دیں، وہیں عمل کے ذریعہ بھی جانور کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کر دکھایا، آج جب کہ جانوروں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر کئی تنظیمیں بیدار ہورہی ہیں، کئی حکومتیں جانوروں کے تحفظ کے لیے سرگرم مہمیں چلارہی ہیں، جانوروں کے حقوق کی رعایت نہ کرنے والوں کے لیے کڑی سے کڑی سزائیں تجویز کی جارہی ہیں، ان قوانین کے پامال کرنے والوں کو قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑرہی ہیں، قربان جایئے نبیِ اکرم ﷺ پر جنھوں نے آج سے چودہ صدی قبل حیوانات کے حقوق کے تحفظ اوران کی حمایت کا اعلان فرمایا، آپ ﷺ نے جانوروں کو بھوکا رکھنے، اسے تکلیف دینے، اس پر سکت سے زائد بوجھ لادنے سے منع فرمایا، نیز جانور کو نشانہ بنانے، جانور پر لعنت کرنے والے کو مجرم قرار دیا، جانوروں کو تکلیف دینے کو آپ ﷺ نے دل کی سختی میں سے شمار کیا۔

جانور کے ساتھ رحم وکرم ان کے ساتھ نرمی کے بے شمار واقعات کتابوں میں مذکور ہیں؛ لیکن ہم چند واقعات واقوال کے نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔

نشانہ بازی

زمانۂ جاہلیت میں جانوروں کو تکلیف دینے کی رائج صورتوں میں ایک اہم صورت زندہ جانور کو نشانہ بازی کے لیے مقرر کرنا تھا، غور کیجیے زندہ جانور کو جب تیروں کے ذریعہ چھلنی کیا جاتا ہوگا تو وہ کس قدر انھیں تکلیف ہوتی ہوگی، آپ علیہ السلام نے اس سے منع فرمایا، ایک دفعہ ابن عمر رضی اللہ عنہ قریش کے چند نوجوانوں کے پاس سے گزرے جو ایک زندہ پرندہ کو لٹکا کر نشانہ بازی کر رہے تھے، وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر متفرق ہو گئے، ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے دریافت کیا: یہ کس نے کیا ہے؟ اس فعل کے مرتکب پر اللہ کی لعنت ہے، پھر ابن عمر رضی اللہ عنہ نے آپ علیہ السلام کا قول نقل کیا: اللہ کی لعنت اس شخص پر ہے جس نے نشانہ بازی کے لیے ذی روح کو استعمال کیا (مسلم: ۹۵۸، باب صبر البہائم) ایک دفعہ ابن عمر رضی اللہ عنہ یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو دیکھا کہ ایک غلام مرغی کو باندھ کر نشانہ بازی کر رہا ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس مرغی کو کھول دیا، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے، اس بچے کو ڈراؤ! اس طرح پرندہ کو قید کر کے قتل کرنے سے روکو؛ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو قید کر کے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے (بخاری: ۵۵۱۴ ما یکرہ من المثلۃ)

پرندہ اور اس کے والدین میں جدائیگی

اولاد سے فطری محبت جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں ودیعت کر رکھی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ جذبہ جانوروں کو بھی عطا کیا ہے، بعض طاقتور جانور تو اولاد کی جدائیگی پر حملہ آور بھی ہو جاتے ہیں؛ لیکن جو جانور کمزور ہو اولاد سے وہ جدائیگی کے غم میں گھٹ جاتا ہے، اسی طرح کا ایک واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر میں پیش آیا، ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم سفر میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ضرورت کے لیے تشریف لے گئے، اتنے میں ہم نے ایک سرخ پرندے کو اس کے چوزوں سمیت دیکھا، لہٰذا ہم نے بچوں کو اٹھالیا، ان چوزوں کی ماں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور اپنے بازو ہلا کر کچھ کہنے لگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے پوچھا کس نے اس پرندے کے بچوں کو اس سے جدا کر کے تکلیف دی ہے، اس کے بچوں کو لوٹا دو (ابوداؤد: ۳۶۷۵، کراہیۃ احراق العدو بالنار)

مثلہ کی ممانعت

جانوروں کو زندہ رکھ کر اگر اس کے اعضاء وجوارح کو کاٹا جائے تو اسے کتنی تکلیف ہوگی؟

اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے، جانوروں کو جن ذرائع سے تکلیف دی جاتی، انھیں میں ایک طریقہ زمانۂ جاہلیت میں مثلہ کا بھی رائج تھا، آپ ﷺ نے اس طریقۂ کار کی مذمت کی، اور اس کے مرتکب پر آپ ﷺ نے لعنت فرمائی، جس شخص نے جانور کا مثلہ کیا، اس پر آپ علیہ السلام نے لعنت فرمائی (بخاری: ۵۵۱۵ ما یکرہ من المثلۃ) ایک دفعہ مثلہ زدہ گدھا آپ ﷺ کے قریب سے گزرا تو آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے اس کے مرتکب پر لعنت فرمائی (مسلم: ۲۱۱۷ باب النہی عن ضرب الحیوان فی وجہہ)

جانوروں پر احسان، مغفرت کا ذریعہ

کسی کی ضرورت کی تکمیل، کسی کی تکلیف کا دفعیہ، جس طرح اس کی ضرورت انسانوں میں پائی جاتی ہے، اسی طرح جانور بھی احسان کے مستحق ہوتے ہیں؛ بلکہ بے زبان جانور انسانوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی احسان کے مستحق ہوتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی تکلیف بیانی کے لیے زبان نہیں رکھتے، لہٰذا آپ ﷺ نے جہاں انسانوں کے ساتھ احسان کی تعلیم دی ہے، وہیں جانوروں کے ساتھ بھی احسان کی ترغیب دی ہے؛ بلکہ بعض خصوصی مواقع پر جانوروں کے ساتھ احسان کو مغفرت کا ذریعہ قرار دیا؛ چنانچہ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ایک راہ رو پیاس سے بے تاب ہوکر کنواں میں اتر کر پانی پی لیتا ہے، جب کنواں سے باہر نکلتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے کیچڑ کھا رہا ہے، اس شخص نے محسوس کیا کہ یہ کتا بھی میری ہی طرح پیاسا ہے، لہٰذا وہ شخص کنواں میں اترا، اور اپنے موزے میں پانی بھر لیا، اور کتے کو سیراب کیا، اس خدمت پر اللہ نے اس بندہ کی قدر دانی کی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کردی، صحابۂ کرامؓ نے سوال کیا؟ کیا ہمیں جانوروں پر بھی احسان کرنے سے اجر ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہر ذی روح پر احسان کرنے سے اجر ملے گا (بخاری: ۶۰۰۹، باب رحمۃ الناس والبہائم) اس سے تعجب خیز واقعہ وہ ہے جو ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ایک دفعہ پیاس کی شدت سے ایک کتا کنواں کے اردگرد گھوم رہا تھا، قریب تھا کہ پیاس کی وجہ سے وہ ہلاک ہوجائے، اچانک ایک گنہ گار عورت جو بنی اسرائیل کی تھی، اس نے اپنے موزے کو نکالا، اور کتے کو پانی پلایا، اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی مغفرت فرمادی، (بخاری: ۳۴۶۷) غور کرنے کا مقام ہے، ایسے جانور کے ساتھ رحم کرنے کو آپ ﷺ نے مغفرت کا ذریعہ قرار دیا ہے، جسے بعض علماء نے نجس العین تک قرار دیا ہے، بعض علماء نے اگر کتا برتن میں منھ

ڈال دے تو سات آٹھ دفعہ برتن کو دھونے کا حکم دیا ہے، اس کے بالمقابل جانوروں کے ساتھ بُرا سلوک بعض دفعہ انسانوں کو جہنم میں بھی لے جاتا ہے، ایک عورت ایک بلی کو تکلیف دینے کے سلسلے میں جہنم میں چلی گئی، اس عورت نے بلی کو باندھ دیا تھا، اس کو نہ کھلاتی تھی اور نہ ہی اس کو چھوڑتی تھی کہ باہر وہ اپنی غذا کا انتظام کرسکے، حتی کہ وہ کمزور ہوگئی اور مرگئی (مسلم: ۲۶۱۹)

جانوروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ

نہ صرف یہ کہ آپ ﷺ خود بھی نرمی کا برتاؤ کرتے تھے؛ بلکہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کی تلقین فرماتے، ایک دفعہ ایک اونٹ بدک گیا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اس اونٹ کو سنبھالنا دشوار ہوگیا، آپ ﷺ باغ میں داخل ہوئے جس میں یہ اونٹ تھا، آپ ﷺ اونٹ کی طرف بڑھ رہے تھے، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یہ اونٹ کٹنے کتے کی طرح ہوگیا ہے، یہ آپ پر حملہ آور ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، جب آپ ﷺ نے اس اونٹ پر نظر التفات کیا تو وہ اونٹ سجدہ ریز ہوگیا، آپ علیہ السلام نے اس کی پیشانی پکڑی اور اسے کام پر لگا دیا، یہ دیکھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کہنے لگے، جب جانور آپ کو سجدہ کرسکتا ہے، ہم انسان ہوکر آپ کو سجدہ کیوں نہ کریں، کسی انسان کے لیے سجدہ درست نہیں، اگر کسی انسان کے لیے سجدہ درست ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کا سجدہ کرے (مسند احمد: ۱۲۶۱۴) ایک دفعہ آپ ﷺ باغ میں داخل ہوئے، وہاں ایک اونٹ تھا، اس نے جیسے ہی آپ ﷺ کو دیکھا تو وہ رونے لگا، آپ ﷺ نے اس کے آنسو پوچھے، وہ خاموش ہوگیا، آپ علیہ السلام نے اس کے مالک کے سلسلہ میں دریافت کیا تو ایک انصاری صحابی نے کہا کہ میں اس کا مالک ہوں، آپ علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم جانور کے سلسلہ میں اللہ سے نہیں ڈرتے، جس کا اللہ تمہیں مالک بنایا ہے، اس سے کام زیادہ لیتے ہو، اور بھوکا رکھتے ہو، (ابوداؤد: ۲۵۴۹)

ذبح میں احسان کا پہلو

جانور بھی بڑی حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں، وہ بھی آثار وقرائن سے پتہ لگا لیتے ہیں کہ اب ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے؛ اسی لیے آپ ﷺ نے جانور کے سامنے چاقو وغیرہ تیز کرنے سے منع کیا، اس سے جانور کو گھبراہٹ ہوگی، نیز آپ علیہ السلام نے ذبح میں احسان

کے پہلو کو اپنانے کی بھی ترغیب دی کہ جانور کو مکمل طور پر ذبح کیا جائے، کہیں اسے تڑپتا ہوا نہ چھوڑے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کو لازم کیا ہے، جب تم قتل کرو تو اچھے انداز میں قتل کرو، جب تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، چھری کو تیز کرلیا کرو، اور مذبوح کو راحت پہونچاؤ (مسلم: ۱۹۵۵) ایک صحابیؓ نے فرمایا: یارسول اللہ ﷺ! میں بکری کو ذبح کرتا ہوں، اس پر رحم بھی آتا ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: اگر تم نے بکری پر رحم کیا تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا (مسند احمد: ۱۵۵۹۲)

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک صحابیؓ جانور کو لٹا کر چھری تیز کرنے لگے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: تم اس جانور کو کئی موتوں سے مارنا چاہتے ہو، لٹانے سے پہلے ہی چھری کیوں نہ تیز کی (مستدرک حاکم: ۷۵۶۳)

ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس نے مذبوحہ چڑیا ہی پر رحم کیوں نہ کیا ہو، اللہ تعالیٰ روزِ محشر اس پر رحم فرمائیں گے، (طبرانی کبیر: ۷۹۱۵) نیز آپ ﷺ نے جانور پر لعنت کرنے سے بھی منع فرمایا، ایک سفر میں ایک صاحب جانور پر لعنت کرنے لگے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے اس اونٹنی پر لعنت کی ہے، وہ ہمارے ساتھ نہ آئے (مسند احمد: ۱۹۷۶۵)

الغرض! آپ ﷺ کی زندگی جانوروں پر رحم کے واقعات سے بھری پُری ہے، یہ چند نقول ہیں جس سے ہمیں عبرت ونصیحت حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم خلقِ خدا کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کریں۔

❁ ❁ ❁

مدارس میں زکوٰۃ کی فراہمی اور طریقۂ استعمال

از: مفتی اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

جب اسلامی حکومت تھی تو مدارس، مکاتب، مساجد اور خانقاہوں کے جملہ اخراجات کی کفالت حکومت کرتی تھی، ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد دین اور علمِ دین کی حفاظت کے لیے حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے آزاد مدارس کی بنیاد ڈالی اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب دیوبندیؒ نے کس مپرسی کے عالم میں اپنے رومال میں تین روپے ڈال کر عوام کے چندے سے مدرسہ چلانے کی طرح ڈال دی؛ لیکن بات آگے بڑھی تو اس میں بے اعتدالی آگئی، اب دین کی حفاظت کے لیے کم لوگ ہی مدارس کھولتے ہیں، اکثر اپنی اقتصادی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مدارس کھولنے لگے ہیں، مدات میں لاپروائی سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے؛ جب قبلہ ہی بدل گیا تو نماز کیسے صحیح ہوگی؟ عملاً ایسا سمجھا جانے لگا کہ دینی علم حاصل کرنے کے لیے زکوٰۃ سے استفادہ ضروری ہے، بہت سے اہلِ ثروت اسی تصور سے اپنی اولاد کو علمِ دین نہیں پڑھاتے، دوسری طرف اس طرح بے اعتدالی ہورہی ہے کہ غیر مستحق طلبہ بھی اِمداد پر پلنے لگے، ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے مدارس کے کسی وصف کو متعین کیسے کیا جاسکتا ہے؟ بس اتنا کہنا ہی بہتر سمجھ میں آتا ہے کہ اگر فقیر و نادار طلبہ تک زکوٰۃ پہنچ سکتی ہو تو وہاں زکوٰۃ دینا جائز ہے اور اہلِ مدارس اگر مستحق تک زکوٰۃ پہنچا سکتے ہوں تو لیں ورنہ احتراز کریں، دین وملت کی خدمت کے بہانے اپنے اعمال کو خراب نہ کریں۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَة قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ. (توبہ:۶۰)

ترجمہ: صدقات (زکوٰۃ) تو صرف غریبوں اور محتاجوں کے لیے ہیں اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کے لیے اور جن کی دل جوئی کرنا منظور ہے، اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں

(زکوٰۃ صرف کی جائے) اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کے راستے (جہاد) میں اور مسافر (کی امداد) میں۔

مدارس کے طلبہ اگر غریب اور محتاج ہیں تب تو ان پر زکوٰۃ صرف کرنے میں مضائقہ نہیں، اور اگر طلبہ کو ''فی سبیل اللہ'' میں داخل مانا جائے تب بھی فقر وحاجت مندی کی شرط ملحوظ رہے گی، مال دار اور صاحبِ نصاب طلبہ پر زکوٰۃ کا مال صرف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی (معارف القرآن ۴/۴۰۶، ۴۰۷)

دینی کاموں میں مصروف علماء اور طلبہ

مدارس کے طلبہ اور علماء جو دینی خدمات میں مصروف ہیں، چاہے وہ درس وتدریس میں ہوں؛ یا تصنیف وتالیف میں یا دعوت وتبلیغ میں؛ وہ اگر فقر وفاقہ سے دوچار ہیں (صاحبِ نصاب نہیں ہیں) تو اُن کو تعاون کے طور پر زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، ان کو کسی خدمت کے معاوضے یا تنخواہ کے طور پر زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

''فی سبیل اللہ'' میں مال دار، صاحبِ نصاب طلبہ اور علماء شامل نہیں ہیں، بعض فقہی عبارتوں سے لوگوں کو شبہ ہوتا ہے؛ اس لیے ان کو جاننا چاہیے کہ فقہائے کرام نے فقر ومحتاجگی کی قید لگائی ہے، معارف القرآن (۴/۴۰۷) میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ نے اس کی صراحت نقل کی ہے، علامہ شامیؒ نے بھی فقر کی قید کو اَوْجَہ (زیادہ مدلل) بتایا ہے۔

أمّا قولُهٗ تعالٰی: "وفي سبيلِ اللّٰه" عبارةٌ عن جميعِ القُرَبِ فَيَدْخُلُ فيه كلُّ مَنْ سَعىٰ في طاعةِ اللّٰه تعالىٰ، و سبيلِ الخيراتِ إذا كان محتاجًا. (بدائع ۲/۱۵٤)

قلت: وهو كذلك، و الأوْجَهُ تقييدُه بالفقير الخ (رد المحتار ۳/۲۸٦ زكريا)

ترجمہ: بہرحال اللہ تعالیٰ کا قول: ''وفی سبیل اللہ'' یہ سارے نیک کام کی تعبیر ہے؛ اس لیے اس میں ہر وہ شخص داخل ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اچھے کاموں میں کوشاں ہو؛ جب کہ وہ محتاج ہو۔

میں (علامہ شامی) کہتا ہوں: وہ اسی طرح ہے اور فقیر ہونے کی قید زیادہ مدلل ہے۔

زکوٰۃ میں تملیک

زکوٰۃ کے جو بھی مصارف قرآنِ پاک میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں مستحق کو مالِ زکوٰۃ کا

مالک بنانا شرط ہے، مالک بنائے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، اس پر ائمہ اربعہ اور جمہور فقہائے امت متفق ہیں۔ اسی وجہ سے تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے خواہ وہ مسجد کی تعمیر ہو یا مدرسہ کی، یا کسی اور رفاہی ادارہ کی۔

قرآن مجید کی آیت: إنَّما الصَّدَقَاتُ للفقراء الخ میں.....

قرآن نے چار مصارف کو ''لام'' اور چار کو ''فی'' کے ذریعہ بیان کیا ہے، لام تملیک لیے ہے اور ''فی'' ظرفیت کے لیے استعمال کیا ہے، ظرفیت سے زیادہ استحقاق کی طرف اشارہ ہے، اِن میں بھی تملیک کی صراحت مفسرین نے فرمائی ہے۔ (تفصیل معارف القرآن میں دیکھیں ۴/۴۰۴، ۴۰۷)

غرض یہ کہ اگر زکوٰۃ مدارس کے مستحق طلبہ کو دی جارہی ہے تو ان کو بھی مالک بنانا ضروری ہے۔

ویُشْتَرَطُ أنْ یَکُوْنَ الصَّرْفُ تَمْلِیْکاً لَا إبَاحَةً (در مختار) فَلَا یَکْفِي فِیْها الْإطْعَامُ إلّا بِطَرِیْقِ التَّمْلِیْكِ. (رد المحتار ۳/ ۲۹۱ زکریا دیوبند)

ترجمہ: اور زکوٰۃ میں مالک بنانے کی شرط لگائی جاتی ہے، اباحت (استفادہ کی اجازت دینا) کافی نہیں ہے؛ لہٰذا ادائے زکوٰۃ میں کھلا دینا کافی نہیں ہے؛ البتہ بطور تملیک کھلانے سے (زکوٰۃ ادا ہوجائے گی)

تملیک کے قائم مقام صورتیں

اگر کوئی صاحبِ نصاب آدمی مستحق کی پرورش کررہا ہے اور مستحق پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا چاہتا ہے تو اس کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں:

(الف) اس کی واضح صورت یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم اس کے حوالے کردے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مصرف میں خرچ کرے، اس صورت میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ تملیک ہوگئی اور زکوٰۃ ادا ہوگئی۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ زکوٰۃ کی رقم سے کوئی چیز خرید کر لائے اور مستحق کے حوالے کردے، مثلاً: کپڑا، دوا وغیرہ اس میں بھی تملیک پائی جاتی ہے؛ اس لیے جائز ہے۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ مستحق کو کھانا دے، اس کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ کھانا اپنے ہاتھ سے دے دے، اس صورت میں بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی کہ دینا پالیا گیا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ مستحق کو کھانا ساتھ میں کھلائے، اس آخری شکل میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

إذَا كَانَ يَعُوْلُ يَتِيْمًا وَيَجْعَلُ مَا يَكْسُوْهُ وَيُطْعِمُهُ مِنْ زكوٰةِ مالِهٖ فَفي الكسوةِ لاشكَّ في الجوازِ لِوُجودِ الرُّكنِ وَهُوَ التَّمليكُ، وأمّا الطعامُ فَمَا يَدفعهُ إليه بِيَدِهٖ يَجوزُ أيضاً لِما قُلنا بِخلافِ مَا يأكُلهُ بلا دفعٍ إليه. (ردالمحتار ۳/۱۷۲ زكريا)

ترجمہ: جب کسی یتیم کی پرورش کررہا ہو اور اس کو اپنی زکوٰۃ کے مال سے کپڑے اور کھانے دے رہا ہو تو کپڑے کے جواز میں تو شبہ نہیں؛ رکن (تملیک) کے پائے جانے کی وجہ سے، رہا کھانا تو جو کھانا اپنے ہاتھ سے اُسے دے دیتا ہے تو (زکوٰۃ کی ادائیگی میں) یہ (صورت) بھی جائز ہے، اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے بیان کردی ہے، بخلاف اس کھانے کے جو بلادیے وہ (ساتھ میں) کھاتا ہے (اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی)

مدارس کے مہتمم کی شرعی حیثیت

مدارس کے مہتمم ایک طرف تو چندہ دہندہ کے وکیل ہوتے ہیں، اس طرح کہ چندہ دینے والے اگر مصرف متعین کرکے دیں تو مہتمم صاحب اسی مصرف میں خرچ کرنے کے پابند ہیں، مثال کے طور پر چندہ (غیر زکوٰۃ) دینے والے نے مدرسہ کی عمارت میں خرچ کرنے کی قید لگائی تو مہتمم صاحب اس کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے مصرف میں خرچ نہیں کرسکتے۔ (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۴/۱۲۵ تلخیص)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ”ظاہراً مہتمم وکیل مُعطِی کا ہے“ (امداد الفتاویٰ ۳/۳۱۶)

مدارس کے مہتمم دوسری طرف طلبہ کے قیّم اور نائب ہوتے ہیں؛ اس لیے ان کا قبضہ طلبہ کا قبضہ کہلائے گا، چندہ دیتے ہی چندہ دہندگان کی ملکیت سے چندہ خارج ہوجاتا ہے، اور اس پر طلبہ کی ملکیت ہوجاتی ہے، مدارس بیت المال کی طرح ہیں اور مہتمم صاحب نگراں کی طرح؛ اس میں طلبہ کا معلوم و متعین ہونا بھی ضروری نہیں ہے جس طرح بیت المال کے مستحقین معلوم و متعین نہیں ہوتے (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۴/۱۲۵ تلخیص)

مستحق طلبہ پر صدقاتِ واجبہ کے خرچ کی صورتیں

مدارس میں آئی ہوئی زکوٰۃ کی رقم کا مستحق تک پہنچنا مہتمم صاحب کے لیے لازم وضروری ہے، اس کے بغیر مہتمم صاحب اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوں گے، اس کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱- اگر نقد وظیفہ کے طور پر زکوٰۃ کی رقم مستحق طلبہ کے حوالے کرتے ہیں تو اس میں تو کوئی اشکال نہیں۔

۲- اور کھانا اگر فرداً فرداً تقسیم کرکے دیا جاتا ہے تو یہ بھی تملیکِ ہے، ان دونوں صورتوں کی دلیل اوپر گزر چکی۔

۳- مہتمم صاحب کو طلبہ کا وکیل ماننے کی صورت میں تملیک طعام ضروری نہیں، اباحت یعنی طلبہ کو بٹھا کر کھلانا بھی جائز ہے۔ (فتاویٰ دارالعلوم ۴/ ۱۲۷ حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری)

۴- طلبہ کو لباس اور علاج کے لیے زکوٰۃ کی رقم دینے سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے، اس میں بھی پہلی صورت کی طرح تملیک واضح ہے۔

۵- دواخانہ میں شریک مستحق طلبہ کے علاج کا بل ادا کرنے سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔

۶- کوئی چیز خرید کر طلبہ کو دے دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

۷- پانی اور بجلی بھی چوں کہ طلبہ پر خرچ ہونے والی چیزیں ہیں؛ اس لیے ان کا بل ادا کرنے سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؛ البتہ ان میں مستحق اور غیر مستحق کے تناسب کا لحاظ ضروری ہے، غیر مستحق کو حساب میں مستثنیٰ کرنا ضروری ہوگا، جس طرح مطبخ میں پکائے جانے والے کھانے میں حساب کیا جاتا ہے۔

۸- اگر مدرسہ کرایہ کی عمارت میں چل رہا ہے تو زکوٰۃ کی رقم سے کرایہ ادا کرنے سے بھی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی؛ اس لیے کہ مہتمم کو طلبہ کا وکیل مانا گیا ہے اور مکان میں رہائش طلبہ نے اختیار کی ہے اور کرایہ بدلِ رہائش ہے۔

۹- بعض وہ چیزیں جن سے طلبہ بالواسطہ فائدہ اٹھاتے ہیں یا وہ ان چیزوں سے سارا فائدہ نہیں اٹھالیتے، جیسے: درس گاہ کی تپائیاں، مدرسہ کی عمارت اور مستعار دی گئی کتابیں وغیرہ؛ ان میں براہِ راست زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، ان کے لیے تملیک ضروری

ہے۔اسی طرح مدارس کے دیگر مصارف، مثلاً: تنخواہ، مہمان نوازی، اجرائے رسائل، دارُالاقامہ اوردعوت وتبلیغ کے جملہ اخراجات میں مہتمم صاحب براہِ راست زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کرسکتے،ان میں بھی تملیک ضروری ہے۔

حیلۂ تملیک

کسی مستحقِ زکوٰۃ سے پہلے مدرسہ کی ضروریات بتادی جائیں، جس کو مدرسہ سے ہمدردی ہو اوراجروثواب کے حصول کا مخلصانہ جذبہ بھی ہو، اوروہ اپنی ملکیت کی چیز کو مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کرنے پرراضی ہو، اس کو زکوٰۃ کی رقم دی جائے کہ وہ اپنی مرضی سے مدرسہ کو دے دے اور مفت میں صدقہ کا ثواب حاصل کرلے، اس کے اوپر کوئی دباؤ نہ ہو، اگر خدانخواستہ وہ لے کر اپنی ضرورت میں صرف کرلے اور مدرسہ کو نہ دے تو مدرسہ والے اس کے خلاف کسی دباؤ کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو حیلۂ تملیک کی گنجائش ہے، حضرت بریرہؓ والی حدیث: لَكِ صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّة (بخاری ۲۰۲/۱، مسلم ۳۴۵/۱) اس کی اصل ہے۔

وَالْحِيلَةُ لَهُ أن يَتَصَدَّقَ بِمِقْدَارِ زكاتِهِ عَلىٰ فَقِيرٍ ثُمَّ يأمرهُ بعدَ ذلك بالصرف إلى هٰذِهِ الوُجوهِ، فيكونُ لِلْمُتَصدِّقِ ثوابُ الصدَقَةِ ولِذَلِكَ الْفقيرِ ثوابُ بناءِ المسجدِ والقنطرةِ. (هندية ٣٩٢/٦، رد المحتار ١٩١/٣ زكريا ديوبند)

ترجمہ: اوراس کا حیلہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار کسی فقیر پر صرف کرے، پھر اسے اِن وجوہ پر خرچ کرنے کو کہے، اس طرح صدقہ کرنے والے کو صدقہ کا ثواب اوراس فقیر کو تعمیرِ مسجد اور تعمیرِ پُل کا ثواب حاصل ہوجائے گا۔

مدارس کا حال

حیلۂ تملیک کے بعد بھی وہ رقم مدرسہ میں ہی خرچ ہوگی، ذمہ دارانِ مدرسہ اپنی ضرورتوں میں خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے، اکثر مدارس کا حال ناگفتہ بہ ہے، ذمہ دارانِ مدرسہ اپنی تنخواہ متعین نہیں کرتے، وہ کفاف کے نام پر اپنی ذات اوراپنے اہل وعیال پر بے تحاشا خرچ کرتے ہیں، ان کو اللہ ربُّ العالمین، مالکِ یوم الدین سے خوف کھانا چاہیے، وہاں کوئی حیلہ کام نہ آئے گا۔انھیں خیرالقرون کے محتاط بزرگوں اور امیروں کو نمونہ بنانا چاہیے!

داخلہ فارم میں توکیل نامہ

چند سال پہلے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ فارم میں ایک ''توکیل نامہ'' شامل کیا گیا، دوسرے مدارس نے بھی تقلید کی، اس کی عبارت یہ تھی:

''میں حضرت مہتمم صاحب یا ان کے قائم مقام کو اپنی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے کا بھی وکیل بناتا ہوں، اور اپنی ضروریات میں خرچ کرنے کا بھی وکیل بناتا ہوں'' (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۲۶/۱۴)

اس میں طلبہ کی ''ضروریات'' کی قید ہے؛ اس لیے مہتمم صاحب اپنے اور اپنے اہل وعیال کے تعیّشات میں خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہوسکتے۔

طلبہ کی ضروریات کا مطلب بھی محدود ہے، جن چیزوں سے طلبہ براہِ راست فائدہ اٹھاتے ہیں وہی مراد ہوں گی، بقیہ چیزوں کے لیے پھر بھی تملیک کی ضرورت باقی رہے گی۔

اگر ''توکیل نامہ'' ایسا تیار ہو، جس میں طلبہ اور مدرسہ کی جملہ ضروریات کی جزوی صراحت ہو تو بات بے غبار ہوسکتی ہے۔

بعض مدارس میں تملیک کی عمدہ صورت

بعض مدارس میں زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ میں تملیک کی یہ صورت رائج ہے کہ مدرسہ کے جملہ اخراجات کا ماہانہ حساب کیا جاتا ہے، اس میں مطبخ، تعلیم، تنخواہِ مدرسین و ملازمین، بجلی، پانی، وغیرہ مصارف شامل ہوتے ہیں، جملہ اخراجات کو طلبہ کی تعداد پر تقسیم کرکے ہر ایک کے حصے میں آنے والی رقم بہ طورِ فیس مقرر کردی جاتی ہے، اور مدِ زکوٰۃ سے ہر مہینہ فیس کے بہ قدر رقم طلبہ کو وظیفہ میں دی جاتی ہے، پھر طلبہ سے مذکورہ فیس میں وصول کرلی جاتی ہے۔

یہ صورت بہت عمدہ اور بے غبار ہے، چھوٹے مدارس میں تو عمل کرنا مشکل نہیں، بڑے مدارس میں بھی ایسا کیا جانا ممکن ہے؛ جس طرح ماہانہ وظیفہ بانٹنے کا نظم ہوتا ہے، اسی طرح زکوٰۃ بھی دی جاسکتی ہے، اور طلبہ کے لیے بھاگنے کا اندیشہ تو ہے؛ مگر اس کی بھی پیش بندی کی کوئی صورت اپنائی جاسکتی ہے۔ فتاویٰ رحیمیہ (۱۵۰/۵) وغیرہ میں یہ صورت لکھی ہے، بڑے مدارس میں ضابطہ بنانا اور اس پر عمل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

اگر کوئی مستحقِ زکوٰۃ قرض لے کر مدرسہ کی ضرورت میں صرف کردے تو زکوٰۃ سے اس کے قرض کی ادائیگی

بعض مدارس میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مستحقِ زکوٰۃ سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے طور پر فلاں شخص سے قرض لے کر مدرسہ میں دے دو، یا مدرسہ کی فلاں ضرورت میں خرچ کردو، پھر مدرسہ والے زکوٰۃ کی رقم میں سے اس کو دیتے ہیں؛ تاکہ وہ اپنا قرض ادا کرلے، یہ صورت بھی جائز ہے؛ اس لیے کہ زکوٰۃ مستحق تک پہنچ گئی۔

کسی مال دار سے مدرسہ کی عمارت بنوا کر، زکوٰۃ سے ادائیگی

اگر کسی مدرسہ میں عمارت کی ضرورت ہو اور مدرسہ کا ذمہ دار کسی مال دار صاحبِ نصاب کو مدرسہ کی عمارت بنانے کے لیے کہے یا کسی کمیٹی سے مدرسہ کی تعمیر کرائے اور تعمیر کے بعد ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے کرے تو یہ درست نہیں؛ اس لیے کہ مال دار شخص یا کمیٹی مستحقِ زکوٰۃ نہیں ہیں اور غیر مستحق کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ہے۔

مدارس کے علاوہ دیگر دینی یا ملی اداروں کے لیے زکوٰۃ کی وصولی

ہر دینی وملی کام کے لیے زکوٰۃ ہی استعمال ہو، بنیادی طور پر یہ تصور غلط ہے، مسلم قوم امداد اور عطیات بھی دیتی ہے؛ اس لیے ملی خدمات کے لیے امداد کی رقم ہی جمع کرنی چاہیے، اگر زکوٰۃ کی رقم جمع کی جائے تو بڑی احتیاط سے مستحقین تک پہنچانا لازم ہوگا۔ غیر مصرف میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر کوئی ادارہ غیر مصرف میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے ذمہ داروں کو جواب دینا پڑے گا، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائیں!

❁ ❁ ❁

دنیا فانی اور آخرت باقی

از: مولانا محمد ضمیر رشیدی
وارثپورہ، کامٹی، ضلع ناگپور (مہاراشٹر)

تجارت کی منڈیاں، صنعتوں کی بہتات، معاشیات کی مضبوطی، حکومت و سیاست کی بالا دستی، دنیاوی ساز وسامان کی کثرت، محلات و باغات، عالی شان کوٹھیاں، عہدے ومناصب، اولاد اور کنبہ وقبیلہ، لباسِ فاخرہ، انواع و اقسام کے لذیذ پکوان وغیرہ اگرچہ دنیا کی وقتی و ظاہری کامیابیوں کی مختلف شکلیں وصورتیں ہیں؛ تاہم ان کا ملنا یا نہ ملنا رب تعالیٰ کی رضا وخوشنودی یا غیظ و غضب کا پیمانہ نہیں کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ ان ساری چیزوں کا تعلق انسان کے جسم میں سانس کے دخول وخروج کے ساتھ وابستہ ہے۔ بالفاظِ دیگر موت کے وارد ہوتے ہی ان ساری چیزوں کا تعلق انسان سے منقطع ہوجاتا ہے۔ لہٰذا یہ چیزیں اصل اور حقیقی کامیابی کی چیزیں نہیں ہیں۔ تب کامیابی اور ناکامی کیا ہے؟ اصل کامیابی اور ناکامی وہ ہے جو مل کر ختم نہ ہو؛ چنانچہ فانی و باقی کے اسی تقابل کو بنیاد بناتے ہوئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔'' (سورہ: النحل۔ آیت نمبر: ۹۶)

دنیاوی مال ومتاع، شرافت وافتخار، قابلیت ولیاقت کی کوئی قیمت نہیں اگر دل ایمان ویقین سے خالی ہو۔ اور اگر اس دنیا کی محبت رب تعالیٰ کے یہاں ایک مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو اللہ جل شانہٗ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیتے۔ اس دنیا کی زندگی کو ''متاعِ قلیل'' کہا گیا ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ اہلِ ایمان کا بھی منتہائے نظر اب دنیا کی کامیابی ہوکر رہ گیا ہے۔ عیش وعشرت کے لیے دنیا کی طلب پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اہل ایمان اللہ کے آخری پیغام کے اصل حاملین ہیں لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہل دنیا کی ''کامیاب دنیا'' پر ہرگز ہرگز رال نہ

ٹپکائیں؛ بلکہ آخری نبی ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے ان کی ''بربادآخرت'' پرآنسو بہائیں کہ یہ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جہنم کی طرف تیزی سے بڑھتا ہی جارہا ہے۔مگرافسوس کا مقام ہے کہ اہل ایمان کو اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کی کوئی فکر لاحق نہیں۔اس پرستم بالائے ستم یہ کہ اب ان کی بھی فکروسوچ پر دنیا کی زندگی ایسی حاوی ہوگئی ہے کہ وہ دنیا کی لذّات و پرتعیش زندگی میں غیروں سے ذرا بھی پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔حالانکہ وہ جس نبی اُمی ﷺ کے نام لیوا ہیں اوران کی اتباع ہرحال میں ضروری ہے، انھوں نے پہاڑوں کوسونا بنانے کی پیش کش پرانکار کردیا تھا۔حتیٰ کہ سخت ترین حالات میں بھی وسعتِ دنیا کی دعا کرنے پرحضرت عمرفاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو تنبیہ فرمائی تھی، جسے خود حضرت عمرؓ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں دربارِرسالت میں حاضرِ خدمت ہوا تو دیکھا کہ حضور ﷺ ایک بوریے پر لیٹے ہوئے ہیں، جسمِ اطہر پر بوریے کے نشانات بھی ابھرآئے ہیں اورسرہانے ایک چمڑے کا تکیہ ہے جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی ہے۔میں نے دیکھا کہ گھر کا کل سامان یہ تھا۔تین چمڑے بغیر دباغت دیے ہوئے اورایک مٹھی جَو۔اس کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ یہ دیکھ کر میں رو دیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیوں رورہے ہو۔ پھرمیں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کیوں نہ روؤں کہ یہ بوریے کے نشانات آپ کے بدنِ مبارک پر پڑے ہیں اورگھر کی کل کائنات یہ ہے جو میرے سامنے ہے۔پھرمیں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ دعا کیجیے کہ آپ کی امت پربھی وسعت ہو۔یہ روم و فارس بے دین ہونے کے باوجود کہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ان پر یہ وسعت، یہ قیصر و کسری تو باغوں اورنہروں کے درمیان ہوں اورآپ اللہ کے رسول اوراس پر یہ حالت، نبی اکرم ﷺ تکیہ لگائے ہوئے لیٹے تھے۔میری بات سن کر بیٹھ گئے۔اورفرمایا ''عمر! کیا اب تک اس بات کے اندر شک میں پڑے ہوئے ہو۔سنو! آخرت کی وسعت دنیا کی وسعت سے بہتر ہے۔ان کفارکواچھی چیزیں دنیا میں مل گئیں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں۔حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میرے لیے استغفار فرمائیں کہ واقعی میں نے غلطی کی۔

البتہ دین اسلام پرعمل کرنے پربطورانعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے حیات طیبہ موعود ہے۔

''چاہے کوئی مرد ہو یا عورت نیک عمل کرکے آوے اورصاحب ایمان ہوتو ہم ایسے لوگوں کو حیاتِ طیبہ عطا کریں گے۔'' (سورہ:النحل۔آیت نمبر:۹۷)

اور یہ حیات طیبہ کیا ہے؟ حیات طیبہ دراصل حیات خبیثہ کی ضد ہے۔ حیات طیبہ عین وہی چیز ہے جس میں ہر طرح کا سکون، عافیت، آسانی وغیرہ شامل ہیں۔ حیات طیبہ میں نیک بیوی، فرماں بردار اولاد، خاتمہ بالخیر، حلال و آسان روزی، سکون وطمانیت، غنائے قلبی، خلقت میں محبت و رعب اور دبدبہ وغیرہ کے علاوہ ہر وہ چیز شامل ہے جن کے حصول کے لیے دنیا کے عام انسان سخت تگ و دو میں رہتے ہیں؛ مگر دین پر عمل کرنے پر بطور انعام مومن کو حق جل شانہٗ حیات طیبہ سے نوازدیتے ہیں۔

اہل ایمان اللہ کے آخری محفوظ و موجود کلام کے حامل ہونے کے ناطے دنیائے انسانیت کے رہبر و ہادی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اپنے اعمال اور اپنی زندگی سے اس کا عملی ثبوت پیش کریں کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ اصل کامیابی رب کی رضا میں پوشیدہ ہے۔ کامیابی اس کے لیے ہے جو جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا۔ اصل کامیابی وہ ہے جہاں جنت کی نعمتیں کبھی بھی ختم نہ ہوں گی؛ بلکہ بڑھتی ہی جائیں گی۔ اور جہاں رب تعالیٰ کا دیدار سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ جہاں اللہ تعالیٰ خود بندوں کو قرآن شریف پڑھ کر سنائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اعلان فرمادیں گے کہ اے میرے بندو! اب میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں ہوؤں گا۔

تاہم آخرت کی غیبی زندگی کی کامیابی کو حقیقی کامیابی سمجھنا اور دنیا کی مشاہدہ والی زندگی پر اس کو ترجیح دینا کوئی سادہ بات نہیں۔ بندہ سے مطلوب ہے کہ وہ ایمان واحتساب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے۔ واضح ہو کہ احتساب اس بات کو کہتے ہیں کہ بندہ کو عمل کے دوران عمل کی فضیلت و قیمت کا استحضار حاصل ہو۔ مثلاً اہل ایمان ایک مرتبہ سبحان اللہ کہہ کر اتنا خوش ہو کہ ہفتِ اقلیم کی سلطنت بھی اسے پھیکی لگنے لگے، ہفتِ اقلیم کی سلطنت تو ایک روز چھوٹ جائے گی؛ مگر ایک مرتبہ سبحان اللہ کا اجروثواب کبھی بھی ختم نہیں ہوگا۔ درحقیقت ایمان واحتساب کے ساتھ اگر عمل کیا جائے تو پھر واقعی زندگی کا لطف ہے؛ اس لیے ہر اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ دین میں کامیابی کا شرح صدر حاصل کریں کہ یقین بغیر دین پر عمل آوری نہیں ہوسکتی۔ اس حقیقت کو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی صورت میں اس طرح سمجھایا ہے۔ ''بیٹا! نیک عمل اللہ تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ یقین کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ جس کا یقین ضعیف ہوگا اس کا عمل بھی سست ہوگا''۔

❁ ❁ ❁

غیروں کی طرف سے اسلام کی نئی فتنہ انگیز تشریحات

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

گوئیلز نے تو کہا تھا: ''جھوٹ کو اتنا بولو کہ وہ سچ محسوس ہونے لگے'' اسی طرح امریکی پروفیسر اور دفاعی تجزیہ نگار سموئیل ہنٹنگٹن (Sammuel Huntington) نے سب سے پہلے جدید تاریخ میں نام نہاد 'اسلامی دہشت گردی'' کی اصطلاح گھڑ کر اتنی کثرت سے استعمال کی کہ وہ سازشی اصطلاح اب حقیقت لگنے لگی ہے۔ ملت کے زعما پریشان ہیں، امام کعبہ، امام وخطیب مسجد نمرہ سے لے کر دنیا بھر کے ائمہ، علماء اور اسلامی دانشوران اپنے تئیں اس داغ کو دھونے کی مسلسل کوشش کررہے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں کمالِ ہنر کہ جس طرح تین ٹھگوں نے ایک دیہاتی سے بکری کے بچہ کو ٹھگنے کے لیے ایک سازش رچی، ایک نے بکری کو کتا بتایا، ایک نے گدھا اور ایک نے لومڑی تو بیچارے دیہاتی نے آخر پریشان ہوکر بکری کو تقریباً مفت میں ہی ٹھگوں کو دے دیا۔ وہی حال امت کے علماء اور مخلص؛ مگر ضروری علم اور ایمانی جرأت سے خالی دانشوروں کا ہے کہ اسلام دشمنوں کے مسلسل پروپیگنڈہ سے دباؤ میں آکر طرح طرح کے فضول، غیر مفید اور مضر ایمان اقدامات کررہے ہیں۔ اسلام دشمنوں نے روس کے زوال کے بعد ایک دشمن کی تلاش میں اسلام کو موزوں تر پایا، جیسا کہ کلدیپ نیر نے خود اپنی کانوں سنی مارگریٹ تھیچر برطانوی پرائم منسٹر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ہمارا اگلا دشمن اسلام ہے۔ امتِ مسلمہ کی سخت جانی اور ایمانی حرارت کا ذائقہ یہ دشمنانِ اسلام پہلے بھی تاریخ میں چکھ چکے ہیں؛ اس لیے اس بار پچھلے تمام تجربات کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک کثیر جہت حملہ امتِ مسلمہ پر بولا گیا، جس میں فوج کے ساتھ ساتھ میڈیا، تعلیم، تفریح تمام محاذ ایک ساتھ کھول دیے گئے۔ آئندہ سطروں میں اس حملہ کے ایک بڑے محاذ ''مسلمانوں کے اندرونی اختلاف'' کو شدید ترین بنا کر فروغ دینے پر کیا گیا ہے۔ اور اسی ضمن میں اسلام کی طرح طرح کی تفسیریں ایجاد کی گئی ہیں۔ سیاسی، صوفی، سنی، وہابی، گنگا جمنی، رواداری اور

نہ جانے کون کون سے برانڈ ایجاد کیے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام کی جو عام سمجھ پچھلے چودہ سو سالوں سے امت میں اللہ اور رسول ﷺ کی مکمل اطاعت کے تصور کے تحت موجود ہے، اس کے بجائے انسانی زندگی کو ٹکڑوں میں بانٹ کر غلامی کو بھی ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ مسجد اور قبرستان میں غلامی کسی اور کی، بازار میں کسی اور کی، عدالت میں کسی اور کی، اور پارلیمنٹ میں کسی اور کی۔ ایک طرف سے ملتِ اسلامیہ کو عسکری (ملٹری)، تہذیبی، علمی، میڈیائی یلغار پر رکھا گیا، فوجوں کو مسلم ممالک میں تعینات کرانے کی سازش (کویت، عراق، افغانستان، الجزائر، مصر) کی گئی، دوسری طرف اس یلغار اور وسائل کی لوٹ مار اور اپنی موجودگی کو مستقل بنانے کے لیے ذہنوں کو پراگندہ اور منتشر کرنے کی مہم بھی بڑے پیمانہ پر چھیڑی گئی، جس کو دماغ واذہان کی جنگ کہا گیا۔ اس جنگ کے تحت قرآن کی بنیادی تعلیمات میں ہی من مانی، ہیر پھیر کردی گئی اور اسلام کا وہ برانڈ پیش کیا جارہا ہے، جو اللہ کے باغیوں، ظالموں، انسانوں کو اپنا غلام بنانے والوں، سودی نظام کی پرورش کرنے والوں اور زنا و بے حیائی کو فروغ دینے والوں کے آگے سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑا رہے۔ اور اسی برانڈ کو آج مختلف حیلوں بہانوں سے امت میں رائج کرنے کی سازش رچی جارہی ہے۔ حالات کا دباؤ اتنا زبردست ہے کہ ملت کے علماء وائمہ کی خاصی بڑی موثر تعداد بھی مرعوب ہوکر اسی راہِ فرار یا بقاء کی طرف بھاگ رہی ہے، جدھر اسلام دشمن شکاریوں نے ہانک کر راستہ خالی چھوڑا ہوا ہے۔ یوروپی ممالک میں جرمنی میں چار ایسے مراکز قائم کیے گئے ہیں، جہاں اسلامیات کے اساتذہ اور ائمہ کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ اور کیا سکھایا جاتا ہے، اس کا ایک نمونہ حاضر ہے۔ ایک مرکز کے ذمہ دار 42 سال کے مہندس خورشید بتاتے ہیں کہ ''انسان کو مذہب سمجھنے کے لیے اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے۔ دینیات کا کام عقلی بنیادوں پر مذہب کی بنیاد کو واضح کرنا ہے۔ یہاں معاملہ سوچے سمجھے بغیر کسی چیز کو یہ کہہ کر قبول کرلینے کا نہیں ہے کہ میں تو ایسے ہی کروں گا؛ کیوں کہ کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہاں کوئی چیز کیوں لکھی ہے؟ خدا انسان سے کیا چاہتا ہے؟ زندگی کے ساتھ مذہب کا تعلق کیا ہے؟'' (یعنی ایمان بالغیب اور کتاب کسوٹی نہیں ہے؛ بلکہ عقل کسوٹی ہوگی، اس کے آگے کیا ہوگا سب کو معلوم ہے) اس پروگرام پر جرمن حکومت 20 ملین یورو خرچ کررہی ہے۔ ان مراکز کے نصاب کے بنانے میں وہاں کی اسلامی تنظیموں کا کوئی تعاون نہیں لیا گیا ہے؛ جبکہ مسیحیوں کے لیے ایسے پروگرام کے نصاب کی تیاری میں کلیسائی تنظیموں سے مشورہ لیے جاتے ہیں۔ (عزیز الہند، دہلی ۲/۱۲/۲۰۱۳ء)

برطانیہ میں افغانستان میں جنگ لڑ چکے لی رگبی کے قتل کے بعد کیمرون بہت طیش میں ہیں۔ ہاں انھیں اس وقت طیش نہیں آتا جب ان کے فوجی لوگوں کو قتل کرکے ان کے سروں پر پیشاب کرنے کی فلم بنا کر انٹرنیٹ پر لگا دیتے ہیں اور نہ تب طیش آتا ہے جب ان کے فوجی بے قصور افغانوں کو شہید کرکے ان کے جسم کے اعضاء: انگلیاں وغیرہ بطور یادگار ساتھ لے جاتے ہیں۔انھوں نے بھی مساجد، مدارس اور اسلامک کمیونٹی سنٹرز کی تطہیر کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ان مقامات کو سڑاند کا مرکز بتایا ہے۔اور ان مراکز پر زبردست دباؤ کے حربہ اپنائے جارہے ہیں ائمہ اور مقررین کو ڈرا دھمکا کر حقائق سے روشناس کرانے اور حق کی تبلیغ سے دور رکھنے کی پالیسی بنائی گئی ہے۔لی رگبی کے قتل کے بعد قائم کی گئی ٹاسک فورس نے جو سفارشات کی ہیں، اس میں یہ سب رہنما خطوط شامل ہیں۔(یعنی ہر جگہ اپنی جارحانہ، ظالمانہ، اسلام دشمنانہ رویہ پر نظر ثانی کرنے کے بجائے اس کے ردعمل کو اسلام سے جوڑ کر ''اسلام کی اصطلاح'' کی آڑ میں ملت میں فکری گمراہی کو پروان چڑھانے کا ماسٹر پلان تیار ہوگیا ہے) (تلخیص: عزیز الہند ۸/۱۲/۲۰۱۳ء)

وطن عزیز ہندوستان میں اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کا کام زوروں پر چل رہا ہے۔ایک تنظیم کو اس معاملہ میں کافی متحرک کیا گیا ہے جو کہ ہندوستان کی تمام مسلم نمائندہ تنظیموں کے عہدیداروں کو سعودی، وہابی بتا کر انتہائی سازشی انداز میں مسائل کا ٹھیکرا غیر ملکی حکومت کے سر پھوڑنا چاہتی ہے۔تنظیم ملکی وسائل میں حصہ داری لینے کی بات کرتی ہے؛ مگر مثال دیتی ہے پرسنل لاء بورڈ، وقف بورڈ، حج کمیٹیوں کی؛ حالانکہ یہ تو قوم کی دولت اور قوم کی امانت ہے، جو حکومت کی سرپرستی میں برباد کی جارہی ہے۔ ہر حکومت بلا استثناء اپنے عہدیداروں کو حکومتی ریوڑیاں بانٹنے کے بجائے یہ مُردوں کی ہڈیاں اور حاجیوں کی گاڑھی کمائی کا پیسہ دیدیتی ہیں کہ انھیں میں سے تیل نکال لو۔کیا مایاوتی جی کی حکومت میں وقف کے ذمہ دار بھی سعودی/وہابی تھے؟ انھوں نے کیا ترقیاتی کام وقف کے لیے کیے تھے؟ ایک بیان میں عہدیدار فرماتے ہیں: ''کچھ غیر ملکی امداد یافتہ افراد اور ادارے ٹوپی اور داڑھی کی چلمن (سنت رسول ﷺ کو چلمن بتانے کی جسارت؟) سے ہمارے ملک کی سالمیت پر حملہ آور ہوکر اس کی تمدنی اور تہذیبی یکجہتی اور امن وآشتی میں نقب زنی کرکے ماحول کشیدہ کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ملک کی جتنی بھی وقف املاک ہیں، وہ سب سنی صوفی مسلمانوں کے ذریعہ وقف کی گئی ہیں، باقی اسلام ماننے کا دعویٰ کرنے والے تمام فرقہ ایصال ثواب کے مخالف ہیں؛ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ سنی صوفی

مسلمانوں کو نظر انداز کر کے ریاستی اور مرکزی سرکاروں نے مسلم وقف سے متعلق معاملات کو ان افراد و تنظیموں کو سونپ دیا ہے جو 80% سنی صوفی مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔ (حالات وطن دہلی ۲۵/۱۱/۲۰۱۳ء)

مزید پروپیگنڈہ ملاحظہ فرمائیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سعودی شہنشاہیت کے اشاروں پر نہیں نکلیں گے۔ سعودی شہنشاہیت کی اپنی مجبوریاں ہیں کہ اسے اپنے ایجنٹ ہندوستان میں اہم عہدوں پر مسلط کرنے پڑ رہے ہیں؛ مگر ہماری حکومتوں کی کیا مجبوریاں ہیں کہ وہ ایسے لوگوں کو ہم پر تھوپے ہوئے ہیں جن کی وفاداریاں ملت سے کم اور شہنشاہیت سے زیادہ ہے۔ (حالات وطن، دہلی ۹/۱۲/۲۰۱۳ء)

کیا یہ پراسرار امر نہیں ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کا ٹھیکرا ایک غیر ملکی حکومت کے سر پھوڑا جائے؟ کیا وقف بورڈ اور حج کمیٹیوں میں نام نہاد صوفی سنی کہلانے والے عناصر کی تقرری سے مسلمانوں کے تحفظ، بے روزگاری، تعلیم کی کمی، تہذیبی یلغار کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ ان تمام مسائل کے لیے غیر ملکی حکومت کیسے ذمہ دار ہوگئی؟ غالباً اس سازشی گروہ کو معلوم نہیں کہ جس وقت بابری مسجد شہید کی گئی اس وقت دہلی کی حکومت کے سب سے قریبی مشیر یہی صوفی سنی علماء تھے؟ اس وقت مرکز میں وزیر بھی اسی فکر کے تھے اور آج بھی محترم کے رحمٰن خاں، محترم غلام نبی آزاد، محترم احمد پٹیل سب کے سب طاقت ور ترین سیاسی لوگ کس ذہن کے ہیں؟ مولانا توقیر رضا خاں صاحب کس فکر کے حامل ہیں؟ کیا یہ سب وہابی سعودی ذہن کے ہیں؟ سعودی حکومت کی کمزوریاں، بزدلی اور شہنشاہیت غلط ہیں؛ مگر اس کا ہندوستانی مسلمانوں کے وسائل کی حصہ داری میں کمی سے کیا تعلق ہے؟ ایک اہم بات یہ ہے کہ ان صوفی اور سنی زعماء کو امریکہ، یورپ، اسرائیل اور اس کے اسلام دشمن کارنامہ اور ہندوستان کے حالات؛ بلکہ ہر مسلم ملک کے معاملات میں دخل دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ ممالک اپنے یہاں اللہ کے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ کے کارٹون اور فلم بنانے والوں پر اور بابری مسجد شہید کرنے والوں کے عقیدہ پر حملہ نہیں کرتے۔

ان حالات میں ضروری ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ سے تعلق مضبوط کر کے ملت کو فکری اور عقیدہ کے انتشار سے محفوظ رکھنے کی مہم چلائی جائے، نہ کہ ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں کی مدد کر کے اللہ اور رسول ﷺ کے غضب کو دعوت دی جائے!

دارالعلوم دیوبند
تجدیدِ دین کی عالم گیر تحریک

از: مولانا محمداللہ قاسمی

انیسویں صدی عیسوی میں یوروپی استعمار کی چیرہ دستیوں اور پوری دنیا خصوصاً عالمِ اسلام پر تصرف اور قبضہ سے ایک عالمگیر سیاسی، سماجی اور دینی بحران پیدا ہو چکا تھا۔ یوروپی استعمار اپنے ساتھ عیسائیت اور الحاد و بے دینی کا ایک سیلاب بلا خیز بھی ساتھ لا رہا تھا۔ پورے عالمِ اسلام کی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اس وقت مسلمانوں کی قوتِ فکر و عمل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور انڈونیشیا سے مراکش تک کے طول و عرض میں کوئی قابلِ ذکر تحریک موجود نہ تھی، جو اس نازک صورتِ حال میں مغربی استعمال اور الحاد کے خلاف آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی۔ ایسے نازک دور اور عالمگیر سناٹے میں پہلی آواز دیوبند سے اٹھی جو اگرچہ ابتدا میں ہلکی اور نحیف تھی؛ لیکن آہستہ آہستہ وہ الحاد و بے دینی اور ظلم و بربریت کے سناٹے کو چیرتی چلی گئی اور نصف صدی کے اندر اندر پوری دنیا میں اس کا ڈنکا بجنے لگا:

تا ابد گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گردوں زدہ ایم

عالمِ اسلام کی مؤثر ترین دینی تحریک

یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی نشاۃِ ثانیہ کی تاریخ میں دارالعلوم کی مسلسل تعلیمی اور تبلیغی جد و جہد کا بڑا حصہ ہے۔ دارالعلوم کی طویل زندگی میں حوادث کے کتنے ہی طوفان اٹھے اور حالات و سیاسیات میں کتنے ہی انقلاب آئے؛ مگر یہ ادارہ جن مقاصد کو لے کر عالمِ وجود میں آیا تھا، انتہائی استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ ان کی تکمیل میں سرگرم عمل رہا۔ فکر و خیال کے

ان ہنگاموں اور فتنۂ مغرب میں ڈوبی ہوئی تحریکوں کے دور میں اگر بالعموم مدارس عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم جیسے ادارے کا وجود نہ ہوتا تو نہیں کہا جاسکتا کہ آج مسلمان جمود و بے حسی کے کس گردابِ عظیم میں پھنسے ہوئے ہوتے۔ ارشاد و تلقین، تبلیغ و تذکیر، تعلیم و تربیت اور اصلاحِ خلق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم کے فضلا مصروفِ عمل نہ ہوں اور ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و تربیت میں انھوں نے اہم کردار ادا نہ کیا ہو، دعوت و ارشاد اور وعظ و تبلیغ کے بڑے بڑے جلسوں کی رونق اس وقت برصغیر میں دارالعلوم ہی کے گرامی قدر علماء کے دم سے قائم ہے۔ بڑے بڑے مدارس اسلامیہ کی مسند تدریس کی زینت آج یہی اصحاب ہیں۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک تعلیم گاہ ہی نہیں؛ بلکہ درحقیقت ایک مستقل تحریک اور تجدید دین کا مرکز ہے جس سے ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ پورے ایشیا، مشرقی و جنوبی افریقہ اور یورپ و امریکہ کے کروڑہا کروڑ مسلمان وابستہ ہیں اور اسے اپنا علمی و فکری مرکز سمجھتے ہیں۔ الحمدللہ دارلعلوم دیوبند کا علمی و فکری فیض ایشیا سے گزر کر افریقہ، یورپ اور امریکہ تک پہنچ چکا ہے۔ ان علاقوں میں دارالعلوم کے فیض یافتہ افراد دینی و علمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور مرکزی شہروں میں دارالعلوم کے طرز پر اسلامی درس گاہیں کھل چکی ہیں۔

برصغیر میں احیائے اسلام کا مرکز

دارالعلوم دیوبند نے برصغیر کے مسلمانوں کی دینی زندگی میں ان کو ایک ممتاز مقام پر پہنچانے کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، یہ نہ صرف ایک بین الاقوامی تعلیمی ادارہ ہے؛ بلکہ ذہنی نشو ونما، تہذیبی ارتقا اور ملّی حوصلہ مندیوں کا ایک ایسا مرکز بھی ہے جس کے صحیح علم، بلند کردار اور نیک نیتی پر مسلمانوں کو ہمیشہ بھروسہ اور فخر رہا ہے۔ جس طرح عربوں نے ایک زمانے میں یونانیوں کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا تھا ٹھیک اسی طرح دارالعلوم دیوبند نے اس زمانے میں علومِ اسلامیہ اور بالخصوص علم حدیث کی جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے وہ اسلام کی علمی تاریخ میں ایک زریں کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان میں نہ صرف دینی علوم اور اسلامی قدروں کی بقا و تحفظ کے زبردست اسباب فراہم کیے ہیں؛ بلکہ اس نے تیرہویں صدی ہجری کے اواخر اور چودہویں صدی کی معاشرتی اور سیاسی زندگی پر بھی بہت دوررس اور نتیجہ خیز اثرات ڈالے ہیں۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جب انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کے

پیش نظر اسلامی علوم وفنون کی قدیم درسگاہوں کو یکسر ختم کردیا تھا، اس وقت ضرورت تھی کہ نہ صرف اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب کی بقا کے لیے؛ بلکہ مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت کے لیے ایک تحریک شروع کی جائے جو مسلمانوں کو الحاد و بے دینی کے فتنۂ عظیم سے محفوظ رکھ سکے۔ اس وقت اسلام کے تحفظ کی تمام ذمہ داری علمائے کرام کے کاندھوں پر تھی؛ کیوں کہ اسلامی حکومت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ علمائے کرام نے اپنا فرض انجام دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور مسلمانوں کی تمام توقعات دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ بدرجۂ اتم پوری ہوئیں۔

دارالعلوم دیوبند سے جو افراد فارغ ہوئے انھوں نے تعلیم وتبلیغ، تزکیۂ اخلاق، تصنیف و تالیف، فقہ وفتاویٰ، مناظرہ وخطابت، صحافت وتذکیر اور حکمت وطب وغیرہ میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی مخصوص خطے میں محدود نہیں ہیں؛ بلکہ ہندو پاک کے ہر ہر خطہ کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل چکی ہیں۔ دارالعلوم نے اپنے یومِ قیام سے اب تک برصغیر کے کونے کونے اور دنیا بھر کے مرکزی اور بڑے شہروں میں اپنے فرزندانِ رشید کو پہنچادیا ہے جو پورے خطے میں آفتاب وماہتاب بن کر چمک رہے ہیں اور مخلوقِ خدا کو ظلمت وجہل سے نکال کر نورِ علم سے مالا مال کررہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت کے لیے صحیح الفکر علماء وفضلاء پیدا کیے، وہیں مدارسِ اسلامیہ کے وسیع نظام کے ساتھ دین واسلام کی اشاعت کا سامان بھی پیدا کیا۔ برصغیر کی پچھلی ڈیڑھ سوسالہ دینی وسماجی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں سب سے زیادہ مثبت اثر دارالعلوم کی تحریک سے پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ حصہ علمائے دیوبند کی علمی ودینی کوششوں کا ہے۔

عالمی دینی تعلیمی تحریک کا مرکز

ہندوستان میں برطانوی نظامِ تعلیم کے جاری ہونے کے بعد جب یہاں ایک نئی تہذیب اور نئے دور کا آغاز ہورہا تھا تو اس نازک وقت میں دارالعلوم کے اکابر نے دینی تعلیم اور مدارسِ اسلامیہ کے قیام کی تحریک شروع کردی، خدا کے فضل وکرم سے ان کی تحریک مسلمانوں میں مقبول ہوئی؛ چنانچہ برصغیر میں جگہ جگہ دینی مدارس جاری ہوگئے اور ایک وسیع جال کی شکل میں روز بروز وسعت پذیر رہے۔ بہت ہی قلیل مدت میں دارالعلوم کی شہرت بامِ عروج کو پہنچ گئی اور بہت جلد

دارالعلوم نہ صرف ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش؛ بلکہ افغانستان، وسط ایشیا، انڈونیشیا، ملیشیا، برما، تبت، سیلون اور مشرقی وجنوبی افریقہ، یورپ، امریکہ وآسٹریلیا کے ممالک کے مسلمانوں کے لیے ایک بین الاقوامی دینی تعلیم کی تحریک کا مرکز بن گیا۔

اس وقت سے لے کر اب تک برصغیر کے طول وعرض میں بحمداللہ بے شمار دینی مدارس جاری ہو چکے ہیں، اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتی کہ جو مدرسے دارالعلوم کے مزاج و مذاق سے ہٹے ہوئے ہیں یا دارالعلوم کے نصابِ تعلیم کی اتباع نہیں کرتے ہیں، ان کا نظام بھی دارالعلوم کے وضع کردہ بنیادی اصولوں پر قائم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج برصغیر میں جس قدر بھی دینی مدارس نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر وہی ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے نقشِ قدم پر یا اس کے قائم کردہ اثرات سے جاری ہوئے ہیں؛ اس طرح دارالعلوم دیوبند کا وجود اسلام کی جدید تاریخ میں ایک عہد آفریں حیثیت رکھتا ہے، اور یہیں سے اس وقت پورے برصغیر میں دینی تعلیم گاہوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں موجود مدارس کا کوئی حتمی اعداد وشمار موجود نہیں؛ تاہم چھوٹے بڑے مدارس کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے زائد ہے۔ یہ تعداد ان لاکھوں مکاتب کے علاوہ ہے جو تقریباً ہر مسجد اور مسلم محلّہ میں قائم ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے علاوہ، پاکستان اور بنگلہ دیش کے چپے چپے میں بھی اسی نہج پر ہزاروں مدرسے قائم ہیں، جن کے بڑے مدرسوں میں ہزاروں طلبہ زیرِتعلیم ہیں۔ پاکستان میں وفاق المدارس کے تحت دس ہزار کے قریب مدارس کا متحدہ پلیٹ فارم بھی قائم ہے جن میں اکثریت دیوبندی مدارس کی ہے۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں بھی دینی مدارس ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ برصغیر کے قریب دیگر ملکوں جیسے مشرق میں برما، شمال میں نیپال، مغرب میں افغانستان وایران اور جنوب میں سری لنکا وغیرہ میں بھی کافی مدارس دارالعلوم کے طرز پر قائم ہیں۔ ان مدارس سے ہزاروں علماء ہر سال فارغ ہوکر معاشرہ میں علم کی روشنی پھیلاتے ہیں۔ براعظم افریقہ کے جنوبی ملکوں خصوصاً ساؤتھ افریقہ میں دارالعلوم کے طرز کے سیکڑوں چھوٹے بڑے مدارس قائم ہیں۔ اسی طرح براعظم یورپ میں خصوصاً برطانیہ میں متعدد بڑے دارالعلوم اور مدارس قائم ہیں۔ بحرانٹلانٹک کے اس پار ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا اور ویسٹ انڈیز میں بھی دارالعلوم قائم ہوچکے ہیں اور دارالعلوم کے نہج پر علوم دینیہ کی تدریس و اشاعت میں مشغول ہیں۔ دوسری طرف مشرق میں آسٹریلیا، فیجی، نیوزی لینڈ وغیرہ میں بھی الحمد

للہ دارالعلوم دیوبند کے نہج پر مدارس قائم ہیں۔

دفاعِ اسلام کا مضبوط قلعہ

دین اسلام کے بنیادی عقائد کی حفاظت، اسلامی افکار وروایات کی پاسداری اور تمام فرقِ باطلہ اور افکارِ فاسدہ سے اسلام کا دفاع دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور فضلاء کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی استعمار کی نحوست سے مسلمانوں کو نت نئے فتنوں سے واسطہ پڑا، اسلام دشمن طاقتوں نے مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنے کے لیے باطل افکار وفرق کو خوب خوب پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ خود مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت زوالِ اقتدار کے ساتھ دینی واخلاقی زوال سے دوچار تھیں۔ مسلمانوں کے عقائد وافکار میں تزلزل اور اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ اس نازک دور میں جب مسلمان سیاسی جنگ ہار چکا تھا، ایک طرف عیسائیت پوری قوت کے ساتھ حملہ آور تھی، آریہ سماج اور ہندوؤں کی یلغار تھی، تو دوسری طرف خود مسلمانوں کی صفوں سے ایسے افراد اور جماعتیں جنم لے رہی تھیں جو مختلف زاویوں سے اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگی تھیں۔

دارالعلوم دیوبند اپنے روزِ قیام سے اب تک اسلام کے دفاع میں تمام فرقِ باطلہ وافکار فاسدہ کے خلاف سدِ سکندری کی طرح ڈٹا رہا اور حدیث مبارک: یَحْمِلُ هَذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلْفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُمْ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَ تَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ، طبرانی (ہر آئندہ نسل میں سے اس علم کے حامل ایسے عادل لوگ ہوتے رہیں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کے غلط انتساب اور جاہلوں کی تاویل کو دور کرتے رہیں گے) کے مطابق دینی عقائد وتعلیمات کا بھرپور دفاع کیا اور قرآن وحدیث اور صحابہ وسلف سے آنے والے متوارث دین کو اس کی اصلی حالت میں نئی نسلوں تک پہنچایا۔ علمائے دیوبند کو اس فرض کی انجام دہی میں مختلف محاذوں پر بیک وقت لڑنا پڑا۔

عیسائیت کا مقابلہ: ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد عیسائی مشنری برصغیر میں اس زعم سے داخل ہوئی کہ وہ ایک فاتح قوم ہیں، مفتوح قومیں فاتح قوم کی تہذیب کو آسانی سے قبول کرلیتی ہیں۔ انھوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کے دل ودماغ سے اسلام کے تہذیبی نقوش مٹادیں یا کم از کم انھیں ہلکا کردیں؛ تاکہ بعد میں انھیں اپنے اندر ضم کیا جاسکے اور اگر وہ عیسائی نہ بن سکیں تو اتنا تو ہو کہ وہ مسلمان بھی نہ رہ جائیں۔ اس محاذ پر دارالعلوم اور اکابرِ دیوبند نے عیسائی مشنری اور

مسیحی مبلغین سے پوری علمی قوت سے ٹکر لی اور نہ صرف علم واستدلال سے ان کے حملے پسپا کردیے؛ بلکہ عیسائی تہذیب اوران کے مذہبی ماخذ پر کھلی تنقید کی، اس سلسلے میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی خدمات سے علمی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔

ہندو احیاء پرستی کا مقابلہ: غیر منقسم ہندوستان کی غالب اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جن کے آباء واجداد کسی زمانے میں ہندو تھے۔انگریزوں نے سیاسی اقتدار پر تسلط جما لینے کے بعد یہاں کے ہندوؤں کو اکسایا کہ یہ مسلمان جو کسی زمانہ میں تمہاری ہی قوم کے ایک حصہ تھے؛ اس لیے اپنی عددی قوت کو بڑھانے کے لیے انھیں دوبارہ ہندو بنانے کی کوشش کرو؛ چناں چہ انگریزوں کی خفیہ سرپرستی میں ''آریہ سماج'' کے ذریعہ مسلمانوں کو مرتد کرنے کی تحریک پوری قوت سے شروع ہوگئی۔اسلام کے خلاف اس فکری محاذ پر حالات سے ادنیٰ مرعوبیت کے بغیر اکابر دارالعلوم نے اسلام کا کامیاب دفاع کیا۔تقریر وتحریر، بحث ومناظرہ اور علمی ودینی اثر ونفوذ سے اس ارتدادی تحریک کو آگے بڑھنے سے روک دیا؛ بالخصوص علمائے دیوبند کے سرخیل اور قائد وامام حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس سلسلے میں نہایت اہم ومؤثر خدمات انجام دیں، برصغیر کی مذہبی وسماجی تاریخ کا ہر معمولی طالب علم حضرت موصوف کی ان خدماتِ جلیلہ سے پوری طرح واقف ہے۔تقسیم ہند کے قیامت خیز حالات میں جب کہ برصغیر کا اکثر حصہ خون کے دریا میں ڈوب گیا تھا، اس ہولناک دور میں بھی شدھی وسنگٹھن کے نام سے مسلمانوں کو مرتد کرنے کی ایمان سوز تحریک برپا کی گئی۔اس موقع پر بھی علمائے دیوبند وقت کے خونی منظر سے بے پرواہوکر میدان میں کود پڑے اور خدائے رب العزت کی مدد ونصرت سے ارتداد کے اس سیلاب سے مسلمانوں کو بحفاظت نکال لے گئے۔

قادیانیت کا مقابلہ: الحمدللہ علمائے دیوبند کو یہ فخر حاصل ہے کہ جب ختمِ نبوت کے اس عظیم بنیادی عقیدہ پر یلغار کی گئی اور انگریز کی خانہ ساز نبوت مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگی تو علمائے دیوبند سب سے پہلے پوری قوت کے ساتھ میدان میں آئے اور مسلمانوں کو اس ارتدادی فتنہ سے خبردار کیا۔اکابر دارالعلوم اور اساطین علمائے دیوبند میدان میں نکلے اور اپنی گراں قدر علمی تصانیف، مؤثر تقاریر اور لاجواب مناظروں سے انگریزی نبوت کے دجل وفریب کا اس طرح پردہ چاک کیا اور ہر محاذ پر ایسا کامیاب تعاقب کیا کہ اسے اپنے مولد منشاء لندن میں محصور ہوجانا پڑا۔ علمائے دیوبند کے علمی وفکری مرکز دارالعلوم دیوبند کی زیر نگرانی حریمِ ختم نبوت کی پاسبانی کی یہ

مبارک خدمت پوری توانائیوں کے ساتھ آج بھی جاری وساری ہے۔

شیعیت کا مقابلہ: دارالعلوم ایک ایسے وقت میں قائم ہوا؛ جب کہ انگریزوں نے لکھنؤ کی شیعی حکومت کا ۱۸۵۷ء میں الحاق کرکے اس کا وجود مٹادیا تھا؛ لیکن اودھ کی شیعی حکومت اورسلطنتِ مغلیہ میں ان کے گہرے اثرات کی وجہ ان کے مذہبی عقائد کی چھاپ پورے ہندوستان پر پڑگئی تھی۔ پورے ہندوستان میں شیعی عقائد اور ان کے مشرکانہ رسوم غیر شیعہ مسلمانوں کے دل ودماغ میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ اگر ان کو صحیح طور پر کلمۂ شہادت بھی ادا کرنا نہ آتا ہو؛ مگر وہ تعزیہ داری اور اس کے ساتھ عقیدت مندی کا والہانہ جذبہ سینوں میں موج زن رکھتے تھے اور اس کو اپنے مسلمان ہونے کی سند سمجھتے تھے۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ شیعہ اتنے بڑے ملک میں سنیوں کے مقابل میں مٹھی بھر تھے؛ لیکن کروڑوں اہل السنۃ والجماعۃ مسلمانوں کے دلوں میں شیعوں نے اپنے سارے عقائد ومراسم، جذبات وخیالات کی چھاپ ڈال دی تھی اور پورے ہندوستان کو شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ علمائے دیوبند کا یہ قابلِ فخر کارنامہ ہے کہ انھوں نے برصغیر کو شیعوں کے ہمہ گیر اثرات سے پاک کیا اور اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد وافکار کی حفاظت واشاعت کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ علمائے دیوبند نے کتابوں، فتاوی اور بیانات کے ذریعہ امتِ مسلمہ کی بھرپور رہنمائی فرمائی۔

شرک وبدعت کا مقابلہ: یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام جب ہندوستان پہنچا تو یہاں کی قدیم تہذیب وتمدن، رسم ورواج، طور وطریق، ذہن ومزاج اور مذہبی تعلیمات وروایات پر اس نے زبردست اثر ڈالا؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہندو تہذیب نے بھی مسلم تہذیب کو کم متاثر نہیں کیا ہے۔ یہ اثرات مسلم سماج میں اس طرح پیوست ہوکر رہ گئے کہ آج یہ احساس بھی مٹ گیا کہ یہ رسم ورواج اور طور وطریق اسلامی معاشرہ میں غیر مسلموں سے آئے ہیں۔ یہی نہیں؛ بلکہ علمائے سوء نے دنیا کمانے کے لیے شرک وبدعت کی تائید میں سامنے آگئے اور انھوں نے مستقل فرقہ کی شکل اختیار کرلی۔ علمائے دیوبند نے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فرض پوری دیانت داری سے ادا کرتے ہوئے پورے ملک میں اہلِ بدعت کا مقابلہ کیا، ان سے مناظرے کیے اور عوام پر حق واضح کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں اور ان کے اخلاف کے ذریعہ اصلاحِ عقائد واعمال کا یہ مبارک سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

غیر مقلدیت کا مقابلہ: تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کی تقریباً تمام اہم مسلم حکومتوں نے مذہبِ حنفی کا اتباع کیا اور فقہِ حنفی ہی تمام قوانین وضوابط کی بنیاد بنا رہا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی غالب اکثریت مذہبِ حنفی کی پابند تھی۔ پوری مسلم تاریخ میں تقلید سے انحراف، اسلامی روایات سے بغاوت اور سلفِ صالحین سے نفرت وکدورت کا کوئی قابلِ ذکر ثبوت نہیں ملتا؛ لیکن آخری زمانے میں جب سلطنتِ مغلیہ روبہ زوال تھی اور ہندوستان میں انگریزوں کے ناپاک قدم پڑ چکے تھے، اس وقت نت نئی جماعتوں نے جنم لینا شروع کیا۔ عدمِ تقلید کا فتنہ بھی اسی تاریک زمانے کی پیداوار تھا۔ اس فرقہ نے بالکل خارجیوں جیسا طریقۂ کار اپنا کر نصوص فہمی کے سلسلہ میں سلفِ صالحین کے مسلّمہ علمی منہاج کو پسِ پشت ڈال کر اپنے علم وفہم کو حق کا معیار قرار دے کر اجتہادی مختلف فیہ مسائل کو حق و باطل اور ہدایت وضلالت کے درجہ میں پہنچادیا، اور فردوطبقہ جو اُن کی اس غلط فکر سے ہم آہنگ نہیں تھا، اس کو وہ ہدایت سے عاری، مبتدع، ضال ومضل، فرقۂ ناجیہ؛ بلکہ دینِ اسلام سے ہی خارج قرار دے دیا۔ علمائے دیوبند نے عمل بالحدیث کے نام سے اباحیت، ذہنی آزادی اور ہویٰ پرستی کے اس فتنہ کا بھرپور مقابلہ کیا اور غیر مقلدین کے ذریعہ اٹھائے گئے مسائل پر ان حضرات نے عظیم الشان تحقیقی مواد یکجا کردیا۔ پچھلی دہائیوں میں عالم عرب خصوصاً سعودی عرب میں تیل کی دولت کے ظہور کے بعد جب اس فتنے نے دوبارہ نہایت شدومد کے ساتھ بال و پر نکالنے شروع کیے اور عرب کی سلفی ووہابی تحریک سے ہم آہنگ ہوکر اور وہاں سے مالی امداد پاکر ہندوستان میں دوبارہ افتراق بین الامت کی کوششیں شروع کیں تو پھر علمائے دیوبند میدان میں آگئے اور انھوں نے علم وتحقیق کی سطح پر غیر مقلدین کی ہفوات کا جواب دینے کے ساتھ پورے ملک میں جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعہ عوام کو اس فتنہ سے باخبر کیا۔

نیچریت اور غیر اسلامی افکار وخیالات کا مقابلہ: اٹھارہویں صدی میں یورپ سے اٹھنے والے اقتصادی اور سائنسی انقلاب میں جہاں سماجی وسیاسی اور تجارتی واقتصادی سطح پر بہت ساری مثبت تبدیلیاں وجود میں آئیں، وہیں مذہبی دنیا میں اس نے کہرام بپا کردیا۔ یورپ کا سائنسی انقلاب دراصل مذہب یعنی عیسائیت سے بغاوت ہی کے بعد وجود میں آیا تھا؛ کیوں کہ عیسائیت علم و سائنس کی ترقیات کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ یورپ کے مذہب بیزار انقلابیوں نے بالآخر مذہب کو فعال اور معاشرتی زندگی سے نکال کر، اسے چرچوں اور انفرادی زندگیوں تک محدود کردیا۔ مذہب کو ناکارہ، فرسودہ اور از کار رفتہ سمجھ کر زندگی کے ہر گوشے کو سیکولزم (لامذہبیت یا مذہب بیزاری) اور

تعقل کے پہلو سے دیکھنے اور پرکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمانوں میں پیدا ہونے والے اس عقل پرست نے جہاں ایک طرف جدید معتزلہ اور نیچری پیدا کیے، وہیں اسی فکر کے پیٹ سے انکار حدیث کے فتنہ نے جنم لیا۔ اخیر زمانے میں تجدید پسندی اور مودودیت بھی اسی فکر کا شاخسانہ تھے۔ علمائے دیوبند نے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور اسلامی حدود کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ان باطل افکار وخیالات سے بھی ٹکر لی۔ انھوں نے دین کے صحیح فہم، اسلامی اصطلاحات و روایات کی سلیم تعبیر اور ہر دور میں اسلامی تعلیمات کی ابدی حقانیت ومعنویت کو ثابت کیا۔

ان تمام تحریکات کے علاوہ جب بھی کسی فرد یا جماعت نے ما انا علیہ واصحابی کے جادۂ مستقیم سے انحراف کیا اور ملتِ اسلامیہ کے اندر غلط افکار ونظریات کے سرایت کر جانے کا اندیشہ ہوا تو دارالعلوم کی جانب سے ہمیشہ ان پر نکیر کی گئی۔ غلط عقائد کا سدِ باب کیا گیا اور اس کی جگہ صحیح و متوارث اسلام پیش کرنے کی خدمات انجام دی گئیں۔ علمائے دیوبند کی انھیں مبارک کوششوں سے الحمدللہ! آج ہندوستان میں دینِ اسلام اپنی پوری صحیح شکل میں نہ صرف موجود ہے؛ بلکہ مدارسِ اسلامیہ، جماعتِ تبلیغ اور دینی اداروں کی برکت سے آج ہندوستان عالم اسلام کے اندر مستند دینی تعلیمات اور صحیح اسلامی روایات کے تحفظ واشاعت میں سب سے ممتاز نظر آتا ہے۔

مرکزِ تجدید واحیائے دین

انیسویں صدی کے استعماری دور میں اکابرِ دیوبند نے اپنی علمی و دینی بصیرت سے اس حقیقت کا پورا ادراک کرلیا کہ سماجی واقتصادی تبدیلیاں جب اقتدار کے زیرسایہ پروان چڑھتی ہیں تو دینی وروحانی قدروں کی زمین بھی ہل جاتی ہے، اس باب میں عثمانی ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ترک قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور مصطفیٰ کمال کی قیادت میں اپنے ماضی سے کٹ گئی جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ ترک اسلامی تہذیب، مغربیت میں فنا ہوگئی اور ایک عظیم اسلامی سلطنت کا صفحۂ ہستی سے وجود ختم ہوگیا۔ الغرض! تہذیبِ اسلام کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ تاریخ کے اس انتہائی خطرناک موڑ پر اکابرِ دیوبند کے سامنے وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ اسلامی تہذیب کو مغربیت کے اس سیلاب سے محفوظ رکھا جائے اور مسلمانوں کے دین ومذہب کا تحفظ کرکے انھیں ارتداد سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پوری بیدار مغزی وژرف نگاہی سے ہر اس محاذ کو متعین کیا، جہاں سے مسلمانوں پر فکری وعملی

یلغار ہوسکتی تھی اور پھر اپنی بساط کی حد تک حکمت وتدبر کے ساتھ ہر محاذ پر دفاعی خدمات انجام دیں۔

اپنی ایک ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں دارالعلوم نے ہندوستانی مسلمانوں کو جہاں ایک طرف سماجی زندگی کا ترقی یافتہ شعور دیا ہے، تو دوسری طرف انھیں فکر وعمل کا توازن بخشا ہے، آج مسلمانوں کا جو طبقہ اسلامی نظریات کی معقول تعبیر، اسلامی افکار کی اطمینان بخش توجیہ اور صحیح اسلامی زندگی اختیار کیے ہوئے ہے، وہ دارالعلوم کی زائد از سو سالہ علمی وعملی جد وجہد کا نتیجہ ہے۔ عام روایات کے برخلاف یہاں کا مذہبی رجحان کبھی رجعت پسند نہیں رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو قدیم وجدید کے حسین سنگم پر قائم ہے اور جس کی اپنی شان دار روایت اس کے تابناک ماضی کی نقیب اور اس کے عظیم مستقبل کی پیامبر ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی ہمہ جہت خدمات کو 'تجدید دین' کا عنوان دیتے ہوئے لکھا: ''تجدید واحیائے دین کی جو تحریک گیارہویں صدی سے ہندوستان کو منتقل ہوئی تھی اور اپنے اپنے دور میں مجدد الفِ ثانیؒ، (شاہ ولی اللہ) محدث دہلویؒ اور شہید بالا کوٹ (سید احمد شہیدؒ) جس امانت کے حامل تھے، دارالعلوم دیوبند اسی وراثت وامانت کا حامل تھا۔ لوگ دارالعلوم کو مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں؛ کوئی اسے علومِ اسلامیہ کی یونیورسٹی سمجھتا ہے، کوئی اسے جہادِ حریت کے مجاہدین کی تربیت گاہ قرار دیتا ہے، کوئی اسے دعوت وعزیمت اور سلوک و تصوف کا مرکز سمجھتا ہے؛ لیکن میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے لفظوں میں اس کو ''بقائے اسلام اور تحفظ دین کا ذریعہ'' سمجھتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجددینِ امت کا جو سلسلہ چلا آرہا تھا، دارالعلوم دیوبند اپنے دور کے لیے مجددینِ امت کی تربیت گاہ تھی۔ یہیں سے مجددِ اسلام حکیم الامت حضرت تھانویؒ نکلے۔ اسی سے دعوت وتبلیغ کی تجدیدی تحریک ابھری جس کی شاخیں چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہیں سے تحریکِ حریت کے داعی تیار ہوئے، یہیں سے فرقِ باطلہ کا توڑ کیا گیا۔ یہیں سے محدثین، مفسرین، فقہاء اور متکلمین کی کھیپ تیار ہوئی۔ مختصر یہ کہ دارالعلوم دیوبند نے نہ صرف یہ کہ نابغۂ روزگار شخصیات تیار کیں؛ بلکہ اسلام کی ہمہ پہلو تجدید و احیائے کے لیے عظیم الشان اداروں کو جنم دیا۔ اس لیے دارالعلوم دیوبند کو اگر تجدید واحیائے دین کی یونیورسٹی کا نام دیا جائے تو یہ اس کی خدمات کا صحیح عنوان ہوگا۔ (ماہنامہ الرشید ساہیوال پاکستان، دارالعلوم دیوبند نمبر، 1976، ص 667)

❁ ❁ ❁

عالمِ عربی کے معروف عالم شیخ البانیؒ شیخ شعیب ارنؤوط کی نظر میں

از: مولانا محمد یاسر عبداللہ

شیخ ناصر الدین البانیؒ (۱۳۳۲ھ-۱۹۱۴ء /۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹ء) گزشتہ صدی میں عرب دنیا کے معروف عالم گزرے ہیں۔ ابتدائے عمر میں ہی ان کا خاندان البانیہ سے ہجرت کر کے شامی شہر دِمشق میں آ بسا اور وہیں شیخ کی علمی نشوونما ہوئی، بعد میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ اور دیگر تعلیمی اداروں کی رونق بنے۔ ان کا اختصاصی فن ''علمِ حدیث'' تھا، آغازِ شباب میں ہی اس علم سے رشتہ جوڑا اور پھر تادمِ آخر اسی کے ہو رہے، اکثر علمی کاوشیں اسی علم کی خوشہ چینی کا ثمرہ ہیں۔ اپنی بعض منفرد تحقیقات کی بنا پر معاصر اہلِ علم کی تنقید کا نشانہ بنتے رہے ہیں(۱)، انہی ناقدین میں سے ایک عصرِ حاضر کے معروف محقق شیخ شعیب ارنؤوط بھی ہیں، جو خود بھی البانوی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا خاندان بھی شام کی طرف ہجرت کر کے یہیں بس گیا تھا۔ شیخ البانیؒ کے ساتھ ان کے خاندانی تعلقات استوار رہے ہیں، کچھ عرصہ قبل شیخ ارنووط کے ایک شاگرد شیخ ابراہیم زیبق نے ان کے حالات اور علمی خدمات پر ایک کتاب ترتیب دی تھی، جو "المحدّث العلّامة الشيخ شعيب الارنؤوط، سيرته فى طلب العلم وجهوده فى تحقيق التراث" کے نام سے عالم عرب کے معروف اشاعتی ادارے "دار البشائر الإسلاميّة، بيروت" سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہے، اس کتاب کے ایک حصے میں شیخ البانیؒ کی تحقیقات کے متعلق ان کی بعض تنقیدی آرا کا تذکرہ ہے۔ علمی دنیا میں اختلاف کوئی اَنہونی چیز نہیں، ''آدابِ اختلاف'' کی رعایت رکھتے ہوئے متانت کے ساتھ شائستہ لب و لہجے اور سنجیدہ اسلوب میں اپنی آرا کا اظہار، معتدل مزاج اہلِ علم کا امتیازی خاصہ رہا ہے۔ شیخ ارنؤوط کی یہ تحریر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، چونکہ شیخ بذاتِ خود ایک نام وَر محقق ہیں، شیخ البانیؒ سے ان کے خاندانی مراسم رہے ہیں، ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے کے مواقع انھیں حاصل رہے ہیں اور ان کی کتب وتحقیقات پر بھی وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں؛ اس لیے تحریر کے مندرجات سے کلی اتفاق نہ ہونے کے باوجود ان کا یہ علمی نقد وتبصرہ، فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت کتاب کے اس حصے کو اردو ترجمانی کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

شیخ البانیؒ کا امتیازی کارنامہ

مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تردّد نہیں کہ شیخ ناصر الدین البانیؒ کو بیک وقت اپنے

موافق ومخالف دونوں طبقوں میں علمِ حدیث کے مطالعے اور اس میں مزید تحقیق وجستجو کا شوق ورغبت پیدا کرنے کا شرف حاصل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ (ماضی قریب میں) انھیں کے دم قدم سے مصروشام میں حدیثی مشاغل کو دوبارہ توانائی نصیب ہوئی ہے۔ اس کارنامے پر اللہ تعالیٰ ان کو مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کا اجروثواب ان کے نامۂ اعمال میں محفوظ فرمائے؛ لیکن وہ اس میدان کے پہلے شہسوار نہیں تھے، ان سے قبل مصر میں شیخ محمد رشید رضا، شیخ احمد شاکر اور ان جیسے دیگر ازہری علما اور شام میں شیخ جمال الدین قاسمی اور شیخ محمد بہجۃ البیطار جیسے (محدثین) گزر چکے ہیں، بنابریں انھیں ترکِ تقلید ورجوع الی السنۃ کا داعیِ اول نہیں قرار دیا جاسکتا؛ لیکن انھوں نے اپنے ان پیش روؤں کے سنجیدہ واطمینان بخش اسلوب سے استفادہ نہیں کیا؛ بلکہ مخالفین کے ساتھ اشتعال انگیز انداز اپنایا، گویا (اس طرزِ عمل سے) وہ انھیں قائل کرنے کی بجائے شکست دینا چاہتے تھے، نتیجتاً (مسلمانوں کے) دوطبقوں کے درمیان ایسی معرکہ آرائی ہوئی کہ جس میں علمی مباحثہ ومناقشہ کی بجائے سب وشتم تک نوبت جا پہنچی۔

مجھے اس بات سے بھی انکار نہیں کہ شیخ کتاب وسنت کے داعی تھے جو بلاشبہ خوش آئند راہ ہے؛ لیکن درحقیقت وہ اپنی تحقیق کی روشنی میں صحیح قرار پانے والی احادیث وسنن کی طرف دعوت دیتے تھے، ان کی چاہت تھی کہ ان کی تصحیح کو ائمۂ متبوعین کے اجتہاد کے برابر کا درجہ حاصل ہو اور متنازع مسائل میں انہی کی رائے ''قولِ فیصل'' قرار پائے؛ لیکن یہ مقام نہ انھیں حاصل ہوا اور نہ ان کے علاوہ کسی کے حصے میں آیا؛ اس لیے کہ (ائمہ فقہاء کا) یہ اختلافِ محمود اللہ تعالیٰ کا پسند فرمودہ ہے اور اسی کے پیدا کردہ اسباب کے تحت وجود میں آیا ہے۔

(غور کیجیے کہ) صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو محض بارگاہِ رسالت (ﷺ) سے علم حاصل کرنے والے تھے؛ لیکن اس کے باوجود بعض مسائل میں ان کے درمیان بھی اختلاف ہوا ہے۔ نیز اختلافی مسائل میں سے جس مسئلے میں بھی ائمہ نے نصوص کی بنیاد پر کوئی قول اختیار کیا ہے، اس کی نظیر صحابہؓ وتابعینؒ میں ملتی ہے۔ فقہی مسائل میں اختلاف کا آغاز عہدِ صحابہؓ میں ہی ہوچکا تھا اور یہ عین منشأ خداوندی کی تکمیل تھی، اسی کا ثمرہ ہے کہ ہماری اسلامی تہذیب میں تنوع اور فہم کے دائروں میں وسعت دکھائی دیتی ہے، جس میں فکری واختراعی مقابلے کے لیے کھلا میدان مہیا ہے۔ اگر علمی اختلافات نہ ہوتے تو یہ عظیم تالیفات منظرِ عام پر نہ آتیں، جن کی بدولت دورِ تدوین سے آج تک ہمارے کتب خانے بھرے پڑے ہیں۔

علمِ حدیث اور شیخ البانیؒ

شیخ ناصر الدینؒ کا امتیازی فن ''علمِ حدیث'' ہے، اس علم کے مطالعہ وتحقیق میں شیخ نے اپنی زندگی کی طویل مدت تقریباً ساٹھ برس صرف کیے ہیں؛ البتہ شیخ کو اس فن میں دیگر محدثین کا سا مقام ہی حاصل ہے، یعنی ان سے بھی خطا وصواب دونوں کا صدور ہوا ہے۔

''نقدِ متن'' کی طرف عدمِ التفات

مجھے شیخ کی اس بات سے بے حد تعجب ہے کہ انھوں نے ''علمُ مصطلح الحدیث'' میں ضرور پڑھا ہوگا کہ ''حدیثِ صحیح وہ ہے کہ جس کی سند راوی سے لے کر نبی کریم ﷺ تک متصل ہو اور وہ روایت' علت یا شذوذ سے خالی ہو'؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ احادیث پر حکم لگانے کے سلسلے میں انھوں نے ''شذوذ'' اور ''علت'' کی طرف توجہ کی، نہ متنِ حدیث پر نقد کرتے ہوئے ان سے اعتنا کیا، لہٰذا ان کے ہاں اسناد ''صحیح'' ہو تو حدیث بھی ''صحیح'' قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایسی بہت سی احادیث کو ''صحیح'' قرار دیا ہے، جن کے متون پر علماء کو کلام ہے، مثلاً:

۱- ''مشکوۃ المصابیح''(۲) اور ''صحیح الجامع الصغیر''(۳) کی روایت ہے: ''الوائدۃُ والموؤدۃُ فی النار''۔ (بچی کو زندہ گاڑنے والی عورت اور جس کو گاڑا گیا ہو دونوں دوزخ میں ہیں) شیخ البانیؒ نے اس روایت کو ''صحیح'' کہا ہے؛ حالانکہ یہ حدیث، قرآنی آیت ''وَإِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ''(۴) (اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جاوے گا) کے صراحتاً خلاف ہے، اگرچہ شیخ نے اس کی دل نہ لگتی توجیہ وتاویل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲- ''سلسلة الأحاديث الصحيحة''(۵) میں شیخ نے درجِ ذیل روایت کو ''صحیح'' قرار دیا ہے: ''إن اللّٰه خلق التربةَ يومَ السبت'' (اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا کیا ہے) اس روایت کو امام مسلمؒ نے بھی ''صحيح مسلم''(۶) میں اسی طرح نقل کیا ہے؛ لیکن یہ حدیث' قرآنِ کریم کے متعارض ہے۔ نیز سند میں اسماعیل بن امیہ کی وجہ سے اس کو ''معلول'' بھی کہا گیا ہے؛ اس لیے کہ اسماعیل نے اس کو درجِ ذیل سند کے ساتھ روایت کیا ہے: ''إسماعيل، عن أيوب بن خالد، عن عبد اللّٰه بن رافع – مولىٰ أم سلمة – عن أبي هريرةؓ مرفوعاً''۔

اسماعیل ہی نے اس روایت کو ''عن إبراهيم بن أبي يحيى، عن أيوب بن خالد'' کے طریق سے بھی نقل کیا ہے اور چونکہ ابراہیم ''متروك'' ہیں؛ اس لیے اسماعیل نے ان کو سند

سے ساقط کردیا۔ امام بخاریؒ نے بھی ''التاریخ الکبیر''(۷) میں اسماعیل بن امیہ ہی سے یہ روایت نقل کی ہے، امام موصوف نے بعض محدثین کا قول نقل کیا ہے کہ: ''عن أبی هريرةؓ عن كعب''، اصح ہے''، یعنی یہ روایت کعبِ احبارؒ کی اسرائیلیات میں سے ہے؛ لیکن شیخ ناصر الدینؒ نے امام بخاریؒ پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''یہ بعض کون ہیں؟ اور حفظ وضبط کے اعتبار سے ان کا کیا مقام ہے؛ تاکہ اس روایت کو عبداللہ بن رافع کی روایت پر ترجیح دی جاسکے؟''۔ آگے لکھتے ہیں کہ: ''یہ حدیث قرآنِ کریم کے خلاف نہیں، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے''۔ لیکن عدمِ مخالفت پر کوئی دلیل ذکر نہیں کی۔

۳-''سلسلة الأحاديث الصحيحة''(۸) میں درج ذیل روایت کو شیخ نے ''صحیح'' قرار دیا ہے: ''أمتی أمةٌ مرحومةٌ، ليس عليها عذابٌ فی الآخرة، وإنما عذابها فی الدنيا''۔ (میری امّت پر خدا کی خاص رحمت ہے، اس کے لیے آخرت میں کوئی عذاب نہیں، اس کا عذاب دنیا میں ہی ہے) اور تصحیح کی علت بیان کرنے کی کوشش یوں کرتے ہیں کہ ''امت سے مراد امت کی اکثریت ہے؛ اس لیے کہ یہ بات تو قطعی ہے کہ بعض لوگ گناہوں سے پاکی حاصل کرنے کے لیے جہنم میں داخل ہوں گے''۔ ہم نے ''مسند احمد''(۹) کی تعلیق میں اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، اور فنِ حدیث کے ماہر امام بخاریؒ نے بھی ''التاریخ الکبیر''(۱۰) میں اس کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے؛ اس لیے کہ انھوں نے اس حدیث کے طرق اور ان میں اضطراب بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: ''والخبرُ عن النبی ﷺ فی الشفاعةِ، وأنَّ قومًا يُعَذَّبون ثم يُخْرَجون أكثرَ وأبينَ وأشهرَ''۔ یعنی ''شفاعت اور کچھ لوگوں کو عذاب دے کر جہنم سے نکالے جانے کے متعلق بہت سی احادیث ہیں، جو زیادہ واضح اور مشہور ہیں''۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے سند کا اضطراب بیان کرنے کے ساتھ متن پر بھی نقد کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ روایت ان صحیح احادیث کے خلاف ہے جو (کثرت کی بنا پر) تواتر کے قریب ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ''امتِ محمدیہ کے کچھ لوگ ابتداءً جہنم میں داخل ہوں گے اور پھر نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے نکالے جائیں گے''۔

بہرکیف شیخ ناصر الدینؒ ''نقدِ متن'' کی طرف چنداں توجہ نہیں کرتے تھے(۱۱)، ان کا دعویٰ تھا کہ متقدمین نے ''نقدِ متن'' کے لیے کوئی منہج متعین نہیں کیا اور نہ ہی اس کے طے شدہ ضوابط ہیں؛ حالانکہ یہ ایک کمزور نقطۂ نظر ہے، ہمارے اس موقف کی دلیل کے طور پر شیخ کی کتاب ''الإجابة

فیما استدرکتہ عائشۃؓ علی الصحابۃؓ'' کافی ہے، جس کا موضوع ''تقدِ متون'' ہی ہے۔

''شذوذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' میں عدمِ تفریق

میرے نزدیک ایک اور قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ شیخ ''لفظِ شاذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' کے درمیان فرق نہیں کرتے، اس مسئلے میں ان کا حال متاخر محدثین جیسا ہے؛ حالانکہ ''شذوذ'' اور ''زیادتِ ثقہ'' دونوں واضح اصطلاحات ہیں اور (محدثین کے ہاں) معروف ہے کہ ''لفظِ شاذ وہ ہے جس کو کسی شیخ کا ایک راوی اکیلا اپنے شیخ سے روایت کرے؛ جبکہ دیگر شاگرد اس کو نقل نہ کرتے ہوں''۔ اب اس راوی سے کہا جائے گا کہ آپ یہ لفظ کہاں سے لائے، جس کو ایک بڑی جماعت آپ کے شیخ سے روایت نہیں کرتی؟

ائمۂ متقدمین، امامِ متقن کی ''زیادتِ ثقہ'' کو قبول کرتے تھے، نیز ''زیادتِ ثقہ'' اور ''شذوذ'' کے درمیان فرق کے قائل تھے۔ اس سلسلے میں مجھے حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث یاد آرہی ہے، جو بحالتِ تشہد انگشتِ شہادت کو حرکت دینے کے متعلق ہے، اس روایت میں عاصم بن کلیب سے صرف ایک راوی زائدہ بن قدامہ نے ''یحرّکھا'' کا لفظ نقل کیا ہے، عاصم کے باقی شاگرد: عبدالواحد بن زیاد، شعبہ، سفیان ثوری، زہیر بن معاویہ، سفیان بن عیینہ، سلام بن سلیم ابو احوص، بشر بن مفضل، عبداللہ بن ادریس، قیس بن ربیع، ابوعوانہ اور خالد بن عبداللہ واسطی ''یحرّکھا'' کی بجائے ''یشیر بھا'' کے الفاظ نقل کرتے ہیں، میں نے ''مسند احمد'' کی تعلیق میں ان تمام طرق کی تخریج کی ہے(۱۲)۔

شیخ ناصرؒ نے ''سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ'' (۱۳) میں لفظِ ''یحرّکھا'' کو ''صحیح'' قرار دینے کی علت یہ بیان کی ہے کہ: ''لفظِ اشارہ، تحریک کے منافی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اشارہ کے الفاظ ''تحریک'' کے متعلق صریح نہ ہوں گے؛ لیکن منافی بھی نہیں''۔

کیا متقدمین علمائے حدیث کے منہج کے موافق اس شاذ لفظ کو ''صحیح'' قرار دینے کے لیے یہ تعلیق کافی ہے؟

اپنے مذہب کی مؤیّد روایات کی تصحیح اور ائمۂ مجتہدین پر بے جا تنقید

بعض اوقات شیخ ایسی احادیث کی بھی تصحیح کرجاتے ہیں، جو ان کے مذاہب کے موافق ہوں، اگرچہ ان کا کوئی قوی شاہد موجود نہ ہو۔ اس سلسلے میں مجھے حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث یاد آئی کہ: ''جب انھوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ آیتِ مبارکہ تلاوت کرتے ہوئے سنا: ''اِتَّخَذُوْٓا

أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ‘‘[۱۴] (انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا رکھا ہے) تو حضرت عدیؓ نے عرض کیا: ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے؟ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: ’’ہاں وہ لوگ بھی اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے؛ لیکن جب علمائے یہود ونصاریٰ ان لوگوں کے لیے کوئی چیز حلال قرار دیتے تو وہ اسے حلال سمجھتے تھے اور جب ان پر کسی چیز کو حرام کردیتے تو وہ اسے حرام سمجھتے تھے، یہی ان کی عبادت کرنا ہے‘‘۔

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ’’جامع الترمذی‘‘[۱۵] میں ضعیف کہا ہے اور اس کا کوئی قوی شاہد بھی نہیں ہے، اس کے باوجود شیخ ناصرؒ نے اپنی کتاب ’’صحیح الترمذی‘‘[۱۶] میں اس کو ’’صحیح‘‘ قرار دیا ہے۔ اور ’’سلسلة الأحاديث الصحيحة‘‘[۱۷] میں تفسیر ’’روح المعانی‘‘[۱۸] کے حوالے سے علامہ آلوسیؒ کا قول نقل کیا ہے:

’’والآيةُ نَاعِيَةٌ عَلىٰ كثيرٍ مِنَ الفِرَقِ الضَّالَّةِ الذينَ تركوا كتابَ اللّٰه وسنةَ نبيه – عليه الصلاة والسلام – لِكلامِ علماءِهِمْ ورؤساءِهِمْ، والحقُّ أحقُّ بِالاتباعِ، فمتىٰ ظَهَرَ وَجَبَ على المسلمِ اتباعُهُ، وإن أخطأ اجتهادَ مقلدِه‘‘۔

’’اس آیت میں ان گمراہ فرقوں کو مطعون کیا گیا ہے، جنھوں اپنے علماء ورؤسا کی باتوں کی بنا پر خدا کی کتاب اور نبی کی سنّت سے روگردانی اختیار کرلی تھی؛ حالانکہ حق اتباع کا زیادہ حقدار ہے، لہٰذا جب حق ظاہر ہوجائے تو مسلمان پر اس کی اتباع واجب ہے، اگرچہ اپنے امامِ مقلَّد کو غلط قرار دینا پڑے۔‘‘

شیخ ناصرؒ مندرجہ بالا حدیث سے استشہاد کرتے ہوئے ائمۂ متبوعین پر نکتہ چینی کرتے تھے، اس موضوع پر میری ان سے گفتگو بھی ہوچکی ہے، میں نے ان سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر علماء ومشائخ کو رب بنانے اور ائمۂ مجتہدین (کی تقلید) میں بڑا فرق ہے؛ اس لیے کہ علمائے یہود ونصاریٰ تو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو ان لوگوں کے لیے حلال قرار دیتے تھے؛ جبکہ یہ ائمہ اپنے اجتہادات میں کتاب وسنت پر اعتماد کرتے تھے، لہٰذا (مشہور حدیثِ مبارکہ کی بنا پر) جس کا اجتہاد درست ہو تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور جس سے خطا واقع ہوئی تو اس کے لیے بھی ایک اجر ہے۔ ان ائمہ کو علمائے یہود ونصاریٰ کے برابر قرار دینا بڑی ناانصافی ہے۔

غیر واضح منہجِ تحقیق

چند چھوٹے رسائل کے علاوہ دیگر حدیثی کاوشوں میں شیخ ناصرالدینؒ کا کوئی واضح منہج نہیں

تھا، بہت پہلے وہ امام سیوطیؒ کی ''الجامع الکبیر'' اور ''الجامع الصغیر'' سے ضعیف احادیث تلاش کرکے اسے ایک الگ کاغذ پر لکھ لیا کرتے تھے، یوں جب ان کے پاس سو یا زیادہ احادیث جمع ہوجاتیں تو ایک چھوٹے رسالہ کی صورت میں چھاپ دیتے تھے، ان میں موضوع اور باطل احادیث بھی ہوتی تھیں۔

میری دانست میں ان احادیث کو نئے سرے سے لوگوں میں پھیلانے کی چنداں ضرورت نہ تھی؛ اس لیے کہ وہ بھلائی جاچکی تھیں اور اہلِ زمانہ میں سے کوئی ان سے واقف نہ تھا، مثلاً: ''علیکم بالعَدَسِ، فانه قَدَسٌ علی لسان سبعین نبیًا''۔ (دال کو لازم پکڑو؛ اس لیے کہ یہ ستر انبیاءؑ کی زبانی مقدّس (غذا) ہے) [۱۹] اور اس جیسی دیگر احادیث۔ شیخ نے ''سلسلة الأحادیث الضعیفة'' میں شائع کردیا ہے، بہتر ہوتا کہ یہ موضوع احادیث نسیان کے پردوں میں ہی گم رہتیں؛ البتہ لوگوں کے درمیان معروف ومشہور احادیث کا حال بیان کرنے اور ان پر نقد کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس سلسلے میں ان کی محنت قابلِ قدر ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اسی طرح ''سلسلة الأحادیث الصحیحة'' میں بھی ان کا کوئی واضح منہج نہیں ہے؛ اس لیے کہ شیخ کو کوئی بھی صحیح حدیث ملتی تو وہ (اپنے) حدیثی نقطۂ نظر سے اس کی تحقیق کرکے اسے اس سلسلے میں درج کرلیتے تھے، ان احادیث کو جمع کرنے کا مشترک پہلو صرف یہ تھا کہ شیخ کو ان کی صحت کا اعتقاد ہے (اور ان کی تحقیق کے مطابق یہ صحیح احادیث ہیں)، میری رائے میں محض یہ بات ایک مستقل کتاب میں احادیث جمع کرنے کے لیے کافی نہ تھی، نیز (اس کتاب کی احادیث میں کسی موزوں ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا، بلکہ کیف ما اتفق ذکر دی گئی ہیں) اگر وہ ان احادیث کو موضوع وار جمع کردیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

تقسیم احادیث اور اسانید کا حذف

شیخ کی قابلِ مواخذہ باتوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ موصوف نے جب ''سنن اربعہ'' (سننِ ابوداؤد، سننِ ترمذی، سننِ نسائی اور سننِ ابنِ ماجہ) کی ''صحیح وضعیف'' احادیث کو جدا جدا شائع کیا تو ان کی اسانید حذف کرڈالیں؛ حالانکہ علمی دیانت کا تقاضہ تھا کہ وہ سندوں کو حذف نہ کرتے؛ اس لیے کہ ''صحیح وضعیف'' کی پہچان کا اہم مدار سند ہی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس طرزِ عمل سے گویا وہ لوگوں کو آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ وہ شیخ کی تحقیق پر ہی اعتماد کریں، اور

ان کی تحقیق جس حکم تک پہنچی ہے، وہ حق اور نا قابلِ مناقشہ ہے۔

نیز حدیثِ صحیح وضعیف کے درمیان (شیخ کا اختیار کردہ) یہ فرق محض تکلف ہے، شاید پسِ پردہ ''سننِ اربعہ'' کی ضعیف احادیث کو مہمل (ونا قابل استدلال) قرار دینا مقصود ہو؛ حالانکہ بہت سی ضعیف احادیث' احادیثِ صحیحہ کے لیے ''شواہد'' ہیں، لہٰذا ان کو صحیح احادیث سے یوں ممتاز کرنا مناسب نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی کتابوں کی تالیف کے موقع پر خود امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائیؒ اور امام ابن ماجہؒ کے بھی قطعاً یہ عزائم نہ تھے؛ اس لیے کہ وہ چاہتے تو محض صحیح احادیث پر بھی اکتفا کرسکتے تھے۔ بنا بریں ''سنن'' سے متعلق شیخ ناصرالدینؒ کے اس کام کو میں ان کے غیر مستحسن کاموں میں شمار کرتا ہوں۔

حکمِ حدیث کے متعلق دیگر ائمہ کے اقوال سے بے اعتنائی

ایک اور قابل گرفت بات یہ ہے کہ شیخ جب کسی ایسی حدیث کو ''صحیح'' قرار دیتے ہیں، جس کو دیگر حفاظ نے ''ضعیف'' کہا ہو تو دیگر اقوال کا تذکرہ نہیں کرتے، اگر وہ ذکر کردیتے تو لوگوں کو ان کے اور دیگر حفاظ کے احکام کے درمیان آزادانہ موازنے کی چھوٹ مل جاتی؛ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو محض اپنے اقوال کی اتباع پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں، جو کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں۔

شیخ البانیؒ کے علمی کام پر نظرِ ثانی کی ضرورت

انھیں امور کی بنا پر میری دانست میں شیخ ناصرالدین البانیؒ کے کام پر درج ذیل انداز سے نظرِ ثانی ہونی چاہیے:

۱- جن احادیث کو شیخ نے صحیح یا ضعیف قرار دیا ہے اور ان سے پہلے ائمۂ متقدمین نے بھی ان کو صحیح یا ضعیف ہی کہا ہے، انھیں اپنے حال پر رہنے دیا جائے۔

۲- جن احادیث پر ائمۂ متقدمین کے برخلاف شیخ نے صحت یا ضعف کا حکم لگایا ہے تو دونوں حکموں میں موازنہ کیا جائے اور دلائل وقرائن کی روشنی میں شیخ ناصر کے موافق یا مخالف حکم بیان کیا جائے۔

اپنی سابقہ بات دہراتے ہوئے میں پھر کہتا ہوں کہ شیخ ناصرالدینؒ ''محدث'' تھے، میں نہیں کہتا کہ وہ ''**حافظُ العصر**'' تھے، انھوں نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس اس علم کے پڑھنے

پڑھانے میں صرف کیے ہیں اور اس طویل صحرانوردی نے ان میں فن کی بہترین مہارت ولیاقت پیدا کردی تھی؛ اس لیے اس میدان میں ان کی مہارت کو کلی طور پر نظرانداز کرنا حق ناشناسی ہوگی۔

شیخ البانیؒ کا فقہی مقام

رہا فقہی میدان تو مجھے ان کا کوئی بھی ایسا مسئلہ یاد نہیں، جس میں ان کی دلیل سے مطمئن ہوکر میں نے ان کی تحقیق قبول کرلی ہو؛ اس لیے کہ فقہ ان کا فن ہی نہیں، نہ ہی علمِ حدیث کی طرح فقہ میں ان کا انہماک رہا ہے، درحقیقت انھوں نے بعض علماء کے شاذ مسائل لے کر ان کے ذریعے اپنے فقہی منہج کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

۱- مثال کے طور پر سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کے قول کو ہی لے لیجیے، ان سے پہلے علامہ ابن حزمؒ ''المُحلّٰی''(۲۰) میں یہ قول ذکر کرچکے ہیں۔ امام شوکانیؒ نے ''الدُّرَر البَهِيَّة'' (۲۱) میں اور نواب صدیق حسنؒ نے اس کی شرح ''الرَّوضة النَّدِيَّة''(۲۲) میں ابن حزمؒ ہی کی اتباع کی ہے۔ اور اپنے اس قول کے لیے ان کے پاس سوائے اس کے کوئی دلیل نہیں کہ سامانِ تجارت میں زکوٰۃ کے متعلق نبی کریم ﷺ سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔

۲- زرعی پیداوار پر کن صورتوں میں زکوٰۃ واجب ہے؟ شیخ نے امام شوکانیؒ(۲۳) کی اتباع میں ان کو صرف چار اجناس میں منحصر کردیا ہے: ۱- گندم، ۲- جو، ۳- کھجور، ۴- کشمش؛ اس لیے کہ نص صرف ان چار اشیا کے متعلق ہے، اور دیگر اشیا کو ان پر قیاس کرنا درست نہیں؛ جبکہ جمہور فقہاء سامانِ تجارت میں وجوبِ زکوٰۃ کے قائل ہیں، نیز وہ شہر کی دیگر مذکورہ اجناسِ اربعہ پر اشیاء خوردنی کو قیاس کرتے (ہوئے ان میں بھی زکوٰۃ کو واجب قرار دیتے) ہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ شیخ نے یہ قول کیسے اختیار کرلیا!! حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ تاجر اپنا مملوکہ مال صندوق میں نہیں رکھا کرتا؛ بلکہ نقصان سے بچاؤ کے لیے ہمیشہ اسے سامانِ تجارت میں بدلتا رہتا ہے، تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاجر صرف اسی مال کا مالک ہے جو اس کے صندوق میں ہے؛ جبکہ اس کے گودام سامانِ تجارت سے اَٹے پڑے ہوں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کے متعلق مقاصدِ شریعت پر ان کی نگاہ کوتاہ تھی، نہ ہی وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے واقف تھے۔

۳- انھیں شاذ اقوال میں سے ایک عورتوں پر حلقہ بنے سونے کے زیورات کو حرام قرار دینے کا قول ہے۔

اس مسئلے میں شیخ نے علامہ ابن حزمؒ کی ''المحلّٰی''(۲۴) کی پیروی کی ہے؛ چنانچہ

''سلسلة الأحاديث الصحيحة''(۲۵) میں بزعمِ خود حرمت کے دلائل نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''کوئی مسلمان نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ بات کے خلاف کسی قول کی طرف نگاہِ التفات نہیں ڈال سکتا، خواہ اس کا قائل علم وفضل اور نیکوکاری میں کیسی ہی شان کا حامل کیوں نہ ہو؛ اس لیے کہ بہرحال وہ معصوم تو نہیں، یہی چیز ہمارے لیے اپنے موقف پر جماؤ کا باعث ہے، (ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ) کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے ان کے علاوہ کسی کا کوئی اعتبار نہ کیا جائے''۔

فہمِ حدیث میں فقہا کا منہج

شیخ کا خیال ہے کہ کسی حدیثِ صحیح کو اصل قرار دینے سے مشکل حل ہوجاتی ہے؛ حالانکہ یہ وسعت بہت سے امور میں خلل کا باعث بن سکتی ہے۔ ائمۂ متقدمین معاذ اللہ! ''حدیثِ صحیح'' کے تارک ہرگز نہ تھے؛ بلکہ وہ ہر حدیث کو اس کا مناسب مقام دیتے تھے، مثلاً حضرت انسؓ کی اِس روایت کو ہی لے لیجیے کہ جب نبی کریم ﷺ سے بعض صحابہؓ نے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ہماری خاطر (اشیاء کی) قیمتوں کا تعیّن فرمادیجیے، تو آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: ''إن اللّٰه هو المسعِّرُ القابضُ الباسطُ الرزاقُ''۔ (اللہ تعالیٰ ہی قیمتیں مقرر کرنے والا، (رزق میں) تنگی اور کشادگی کرنے والا ہے اور وہی رزق دینے والا ہے) اِس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ''جامع الترمذی''(۲۶) میں نقل کیا ہے، اس کے باوجود ائمۂ مجتہدین ''نرخ بندی'' کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: ''بلاشبہ یہ حدیث، حق وسچ اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے؛ لیکن یہ ''عام مخصوص منه البعض'' کی قبیل سے ہے، انھوں نے اس حدیث کو اُس صورت کے ساتھ خاص کیا ہے جس میں بائع ومشتری کا باہمی معاملہ صلاح پر مبنی ہو اور دورِ حاضر کی طرح ان میں حرص ولالچ نہ ہو، بلاشبہ ایک ایسے معاشرے میں ''نرخ بندی'' ترک کردی جائے گی؛ لیکن معاشرتی تبدیلی کی صورت میں قیمتوں کا تعین ناگزیر ہے۔

شیخ محمد بخیت مطیعیؒ نے امام نوویؒ کی ''المجموع'' کے ''تکملة''(۲۷) میں اس مسئلے کے متعلق علماء کے مختلف اقوال جمع کردیے ہیں؛ لیکن شیخ ناصر الدینؒ ایسے امور کی طرف التفات نہیں فرماتے، ان کے نزدیک (سنداً) صحیح حدیث کی مخالفت جائز نہیں؛ حالانکہ ائمۂ سلف بھی صحیح احادیث کے مخالف ہرگز نہیں تھے؛ بلکہ وہ احادیثِ رسول کو واضح فرماتے تھے اور اس سلسلے میں

وظیفۂ نبوت کی پیروی کرتے تھے،(جس کا اِس آیت میں ذکر ہے) فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ'' (۲۸) ''اے پیغمبر! ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے؛ تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں''۔ یعنی لوگوں کے سامنے مرادِ باری تعالیٰ واضح کریں؛ چنانچہ ائمہ مجتہدین بھی یہی وضاحت کا فریضہ ادا کرتے تھے؛ لیکن وہ معصوم نہیں ہیں، خطا وصواب دونوں ہی احتمال رکھتے ہیں؛ البتہ نصوص کے فہم کے لیے جو منہج انھوں نے اختیار کیا ہے، وہ شریعت کے درست فہم تک پہنچاتا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ ائمۂ مجتہدین نے اگر کسی حدیث کو رد کیا ہے تو صحابہؓ میں بھی اس کے رد کرنے والے ملیں گے اور وہ ایسی احادیث کو لیتے ہیں جن پر کسی نہ کسی صحابیؓ کا عمل ہو، مثلاً: درج ذیل حدیث کو دیکھئے: ''مَنْ مسّ ذَكَرَهُ فليتوضأ''۔ (جس نے اپنے ذکر کو چھوا تو اسے چاہیے کہ وضو کرے) اس حدیث کو امام احمدؒ نے ''مسند احمد''۔ (۲۹) میں نقل کیا ہے اور (سنداً) ''صحیح'' حدیث ہے، اسی پر امام شافعیؒ کا عمل ہے۔

اب ایک اور حدیث پر نظر ڈالیے: ''إنَّما هُوَ بُضْعَةٌ مِنْكَ''۔ (وہ تو تیرے جسم کے گوشت کا ہی ایک ٹکڑا ہے) اس حدیث کو بھی امام احمدؒ نے ''مسند احمد''۔ (۳۰) میں نقل کیا ہے اور (سنداً) یہ ''حسن'' ہے، امام ابوحنیفہؒ اسی کو لیتے ہیں؛ چنانچہ امام شافعیؒ کے ہاں ''مسِ ذکر'' ناقضِ وضو ہے؛ جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ناقض نہیں، اور دونوں نے اپنے مذہب کے سلسلے میں اپنے تئیں صحیح احادیث پر ہی اعتماد کیا ہے، اسی طرح صحابہؓ وتابعینؒ میں سے بھی بعض نے ان میں سے ایک حدیث کو لیا اور بعض نے دوسری حدیث پر عمل کیا ہے۔

یہ (فقہی) اختلاف تو دورِ صحابہؓ سے چلا آرہا ہے، اور صحابۂ کرامؓ کی تعریف خود اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے: ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ''۔ (۳۱) (تم وہ بہترین امّت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ یہ ''خیریت'' محض سلوک میں منحصر نہیں؛ بلکہ علم بھی اس کے تحت داخل ہے؛ اس لیے کہ سلوک کی بنیاد تو علم ہے اور وہ علم کا ہی ثمرہ ہے۔ لہٰذا اختلاف جب تک عقل وفہم کے دائرے میں رہے تو وہ تنوع کا کرشمہ اور اجتہاد وابداع کی جلوہ گاہ ہے، اسلام اس کو پسند کرتا اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؛ البتہ جب اختلاف، عقل سے قلب کی طرف سرایت کرجائے اور اس کی کوکھ سے باہمی کش مکش، سب وشتم، قطع تعلق اور کینہ

وعداوت جیسے موذی باطنی امراض جنم لینے لگیں تو وہ شرعاً ممنوع ہوجاتا ہے، اسلام ایسی چیزوں کو کبھی بھی پسند نہیں کرتا۔

بعض دیگر فقہی آرا

شیخ کی بعض فقہی آرا گردوپیش کے زمانے سے ان کی دوری کی دلیل ہیں، ان کے کئی قریبی شاگردوں کے واسطے سے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ حرمتِ اختلاط کی بنیاد پر کسی طالبِ علم یا طالبہ کے جامعات اور یونی ورسٹی جانے کو حرام قرار دیتے تھے، گویا اس طرح وہ یونی ورسٹیوں کو مسلمان طلبہ سے خالی کرنا چاہتے تھے۔ نیز وہ مسلمان طلبہ کے ذہنوں میں اسلام کے عمومی اصول راسخ کرنے اور اس کا منہج واضح کرنے کی بجائے بعض ایسی چیزوں کے داعی تھے، جن کے ترک سے دورِ حاضر میں کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، مثلاً: داڑھی رکھنا اور پتلون ترک کرنا، وغیرہ۔ (۞)

چنانچہ جس طرح وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے ناواقف تھے، اسی طرح اسلام کے اجتماعی ومعاشرتی نظام سے بھی نابلد تھے؛ بلکہ ان کے ہاں اس عظیم دین کا کوئی جامع نظریہ ہی نہیں ملتا؛ کیونکہ اس موضوع کو نہ تو انھوں نے پڑھا اور نہ ہی اس طرف توجہ کی ہے۔

شیخ ناصرؒ کی ''سلفیت'' نصوصِ شرعیہ کے گہرے فہم کی بنیاد پر ہے، نہ امت پر طاری تقلید جامد کو توڑنے کے لیے؛ بلکہ یہ ''نصوص کی حرف بہ حرف اتباع'' ہے، جس سے (آج کے دور میں) داؤد ظاہریؒ اور ابن حزمؒ کی یادیں تازہ ہوگئیں ہیں، ایک ایسی اتباع جس میں دیگر تاویلی وجوہ کا کوئی اعتراف ہی نہیں۔

مخالفین کے ساتھ شدت آمیز رویہ

ان تمام باتوں کے باوجود میں انھیں ایک مخلص انسان سمجھتا ہوں، جس نے حصولِ جاہ ومنزلت کی بجائے محض رضائے خداوندی کی خاطر علم حاصل کیا؛ لیکن میں انھیں (ہر نوع کی غلطیوں سے) پاک نہیں سمجھتا، ان کے اخلاص کے پورے اعتراف کے باوجود ان کا اپنے مخالفین

(۞) زیرِ بحث مسائل کے متعلق اتنی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام غیر محرم مرد وعورت کے اختلاط کو ناپسند کرتا ہے، لہٰذا دورِ حاضر میں عصری تعلیمی اداروں کا مخلوط تعلیمی نظام، اسلامی مزاج سے قطعاً موافقت نہیں رکھتا، یہ نظام بے شمار شرعی، اخلاقی معاشرتی خرابیوں کا باعث ہے، آئے دن کے احوال واقعات سے اس بات کی تصدیق ہوتی رہتی ہے؛ رہا داڑھی کا مسئلہ تو اس کے متعلق نرم موقف رکھنے والے علماء کے ساتھ ایک عرصے سے مباحث جاری ہیں اور جمہور اہلِ علم وجوب ہی کے قائل ہیں، بہرکیف ان مسائل میں شیخ ارنؤوط کی تعبیر وتشریح سے کلّی اتفاق نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلے میں شیخ البانی کی رائے درست ہے۔

کے ساتھ سخت رویہ جو اہل علم میں ہمیں نہیں دکھائی دیتا، میرے نزدیک قابلِ نقد ہے، آپ کا کسی مسئلے میں ان سے اختلاف کرنا ہی ان کے نزدیک (زبان کے نشتر لگانے کے لیے) کافی ہے، پھر وہ آپ کو ایسے اوصاف سے نوازیں گے جن سے وہ ہمیشہ اپنے مخالفین کی مدح سرائی کرتے رہتے ہیں، مثلاً جمہور فقہاء کی رائے اختیار کرنے والے کو یوں یاد کرتے ہیں: ''**هذا جمهوري**'' (یہ جمہور کا پیروکار ہے) گویا یہ کوئی عیب ہے، اسی طرح ''**هذا لايفقه**'' (اس کو سمجھ بوجھ ہی نہیں)، ''**هذا ليس بفنه**'' (یہ اس فن کا آدمی ہی نہیں)، ''**هذا ليس عنده تحقيق**'' (اس شخص کے ہاں تحقیق کا کوئی گزر نہیں) اور ان کے علاوہ ایسے اوصاف کہ جن کو ایک عالم کجا، عام آدمی بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔

شیخ کی یہی شدت ان کے پیروؤں میں بھی سرایت کرگئی ہے، ان کی آرا کی بنا پر آئے دن مساجد میں ہونے والے جھگڑوں کا ہر ایک تذکرہ کرتا ہے کہ ان کی وجہ سے کیسے باہمی عداوتوں تک نوبت جا پہنچتی ہے!!

ہماری معلومات کے مطابق ائمہ متقدمین بھی اپنی آرا کا اظہار کرتے تھے؛ لیکن دیگر اہلِ علم کی آرا کا احترام بھی کرتے تھے، وہ اپنے مخالفین کے خلاف جارحانہ کلمات زبان پر نہیں لاتے تھے، ان ائمہ کا یہ جملہ سب کو یاد ہوگا، جو ان سے منقول اور مشہور ہے کہ: ''**رأيي صوابٌ يحتمل الخطأ، ورأى غيري خطأ يحتمل الصواب**''۔ (میری رائے درست لیکن غلطی کا احتمال ہے اور دیگر آرا غلط؛ لیکن درستگی کا امکان رکھتی ہیں) نیز امام اسحاق بن راہویہؒ کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا یہ جملہ بھی ہمیں یاد ہے کہ: ''**مَا عَبَرَ جسرَ بَغْدَادَ أحدٌ أعلمُ مِنْ إسحاق بن راهويه ، غير أننا نُخالفُه في أشياء**''۔ (اسحاق بن راہویہؒ سے بڑا عالم اس شہرِ بغداد کے پل سے نہیں گزرا؛ لیکن کچھ مسائل میں ہمارا ان سے اختلاف ہے)۔

شاید شیخ البانیؒ کا یہ تشدد ائمہ کبار کے بیان کردہ اس قاعدہ سے دوری کا نتیجہ ہے کہ ''**لَا يُنْكَرُ الْمُخْتَلَفُ فِيْه**'' (سلف کے درمیان مختلف فیہ مسئلے پر انکار نہیں کیا جائے گا) یعنی اختلافی مسائل میں کسی مجتہد پر نکیر نہیں کی جائے گی؛ لیکن شیخ کا رویہ اس قاعدے کے برخلاف ہے، وہ اختلافی مسائل پر بھی نکیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ **إنَّهُ خيرُ مَسْؤُولٍ، والحمدُ للّٰه رب العالمين**۔

❁ ❁ ❁

مآخذومراجع

۱:.....ملاحظہ فرمائیں:

۱–الألبانی شذوذه وأخطائه لمولانا حبيب الرحمن الأعظمی، مكتبة دارالعروبة كويت ، ١٤٠٤–١٩٨٤ء۔

٢–تناقضات الألبانی الواضحات فيما وقع له فی تصحيح الأحاديث و تضعيفها من أخطاء وغلطات للشيخ حسن السقّاف،دارالإمام النووی عمان الأردن ، ١٤١٣ھ–١٩٩٢ء۔

٣–خطبة الحاجة ليست سنّة فی مستهلّ الكتب والمؤلفات للشيخ عبدالفتّاح أبوغدّة رحمه الله، دارالبشائر الإسلامية بيروت،١٤٢٩ھ،٢٠٠٨ء۔

٤–التعريف بأوهام من قسّم السنن إلى صحيح وضعيف للشيخ محمود سعيد ممدوح، دارالبحوث للدراسات الإسلاميّةوإحياء التراث دبئی ،١٤٢١ھ–٢٠٠٠ء۔

٥–تنبيه المسلم إلی تعدی الألبانی علی صحيح مسلم للشيخ محمود سعيد الموقر۔

٦– إباحة التحلّی بالذهب المحلق للنساء والردّ علی الألبانی فی تحريمه للشيخ اسماعيل الأنصاری –رحمه الله–

٧– تصحيح حديث صلاة التراويح عشرين ركعة ، والرد علی الألبانی فی تضعيفه ، للشيخ اسماعيل الأنصاری– رحمه الله –

٢:.....مشكوة المصابيح بتحقيق الشيخ الألبانی،كتاب الإيمان،باب الإيمان بالقدر، ج:١،ص:٣٩، رقم الحديث: ١١٢، المكتب الإسلامی، ١٣٩٩ھ–١٩٧٩ء۔

٣:.....صحيح الجامع الصغير وزيادته، ١٢٠٠/٢،رقم الحديث :٧١٤٢، المكتب الإسلامی ١٤٠٨ھ – ١٩٨٨ء۔

٤:.....التكوير :٨۔

٥:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،٤/٤٤٧–٤٤٨،رقم الحديث:١٨٣٣، مكتبة المعارف رياض ، ١٤١٥ھ– ١٩٩٥ء۔

٦:.....صحيح مسلم،كتاب صفة القيامة والجنّة والنار،باب ابتداء الخلق وخلق آدم عليه السلام، ٤٤٩/٧،رقم الحديث:٧٠٤٩،مكتبة البشری كراتشی۔

٧:.....التاريخ الكبير،١/٤١٣– ٤١٤،دائرة المعارف العثمانية حيدرآباد دكن ١٣٦١ھ۔

٨:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،٢/٦٤٨–٦٤٩،رقم الحديث :٩٥٩۔

٩:.....مسندأحمد بتحقيق الشيخ شعيب الارنؤوط،رقم الحديث:١٩٦٧٨،مؤسّسة الرّسالة بيروت۔

١٠:.....التاريخ الكبير،١/٣٨– ٣٩۔

١١:.....یہی بات ان کے متعلق ایک اورمعاصرعالم معروف محقق ومحدّث شیخ عبدالفتاح ابوغدّہ رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ) نے بھی لکھی ہے: ’’وإنما أدی إلی هذا الشذوذ اعوجاجُ فهمه لبعض النصوص لضعف معرفته بأصول الفقه، بل أصول الرواية والدراية أيضا‘‘. (خطبة الحاجة ليست سنّة فی مستهلّ الكتب والمؤلفات، ص: ٥٢)۔(بعض نصوص میں کج فہمی نے ان (شیخ البانی رحمہ اللہ) کواس شذوذ تک پہنچادیا ہے، اوراس کی وجہ اصول فقہ؛ بلکہ

اصولِ روایت ودرایت سے واقفیت کی کمی ہے)

۱۲:.....مسند أحمد،رقم الحديث:۱۸۸۷۰۔

۱۳:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۵۵۲/۷،رقم الحديث:۳۱۸۱۔

۱۴:.....التوبة:۳۱۔

۱۵:.....سنن الترمذی بتحقيق الدكتور بشارعواد معروف،أبواب تفسير القرآن،باب:''ومن سورة التوبة''۱۷۳/۵،رقم الحديث:۳۰۹۵،دار الغرب الإسلامی بيروت، ۱۹۹۸ء۔

۱۶:.....صحيح الترمذی،۵۶/۳،رقم الحديث: ۲۴۷۱، المكتب الإسلامی ۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء۔

۱۷:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۸۶۶/۷،رقم الحديث:۳۲۹۳۔

۱۸:.....روح المعانی، تفسير قوله تعالى:''اتخذوا أحبارهم''(التوبة:۱۳)۵/ ۲۷۶،دارالكتب العلميّة بيروت ۱۴۲۶ھ- ۲۰۰۵ء۔

۱۹:.....سلسلة الأحاديث الضعيفة،۵۷/۱،رقم الحديث:۴۰،و ۶/۲،رقم الحديث:۵۱۰،المكتب الإسلامی ۱۴۰۵ھ- ۱۹۸۵ء۔

۲۰:.....المحلی،كتاب الزكوة،باب أحكام التجارة،۲۳۳/۵- ۲۴۰، دارالتراث القاهرة۔

۲۱:.....الدررالبهيّة،كتاب الزكاة،باب زكاة الذهب والفضّة،ص:۲۲، مكتبة الصحابة طنطا مصر ۱۴۰۸ھ- ۱۹۸۷ء۔و السموط الذهبيّة الحاوية للدرر البهيّة للشوكانی، كتاب الزكاة، باب زكاة الذهب والفضة، ۱۰۷، مئوسّسة الرسالة بيروت ۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء۔

۲۲:.....الروضة النديّة شرح الدررالبهيّة،كتاب الزكاة،باب زكاة الذهب والفضة،۲۸۶/۱،المكتبة العصريّة بيروت ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء۔

۲۳:.....نيل الأوطارشرح منتقى الأخبار من أحاديث سيّد الأخيار،كتاب الزكوة،باب الزروع والثمار،۱۶۱/۴، مكتبة مصطفى البابی مصر۔

۲۴:.....المحلّی،باب أحكام لبس الحرير والذهب،۸۴/۱۰۔

۲۵:.....سلسلة الأحاديث الصحيحة،۵۹۶/۱،رقم الحديث:۳۳۷۔

۲۶:.....سنن الترمذی، أبواب البيوع، باب ماجاء فی التسعير،۵۷۲/۲، رقم الحديث: ۱۳۱۴۔

۲۷:.....تكملة المجموع شرح المهذب،كتاب البيوع،باب النجش،۱۰۹/۱۲-۱۲۱،داراِحياء التراث العربی ۱۹۹۵ء۔

۲۸:.....النحل:۴۴۔

۲۹:.....مسند أحمد،رقم الحديث:۲۷۲۹۳۔

۳۰:.....مسند أحمد،رقم الحديث:۱۶۲۸۶۔

۳۱:.....آل عمران:۱۱۰۔

❁ ❁ ❁

تعارف وتبصرہ

نام کتاب : مسلک اہل السنۃ والجماعۃ یعنی علمائے دیوبند کے عقائد ونظریات
مؤلف : جناب مولانا توحید عالم قاسمی بجنوری، مدرس دارالعلوم دیوبند
صفحات : ۱۷۲ سنِ اشاعت: ۲۰۱۴ء قیمت: ۴۵ روپے
ناشر : ادارۂ فکر وعمل دیوبند 09760230025
تبصرہ نگار : اشتیاق احمد قاسمی

==========

علمائے دیوبند کا امتیاز ''اعتدال'' ہے، دینِ اسلام کے پانچ شعبے ہیں؛ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق اور معاشرت؛ علمائے دیوبند نے ہر شعبہ میں اعتدال کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے، اسی وصف نے اِن کو تاجِ رہبری عطا کی ہے، ڈیڑھ صدی سے امتِ مسلمہ میں ان کا اعتبار واعتماد بحال ہے۔ اسی امتیاز کی وجہ سے راہِ اعتدال سے ہٹی ہوئی جماعتیں آپس میں لڑنے کے بجائے علمائے دیوبند سے دست وگریبان ہیں، ان کی تنقید کا نشانہ علمائے دیوبند ہی رہے ہیں؛ حالاں کہ انھوں نے کوئی نیا عقیدہ یا نیا مسلک نہیں بنایا؛ بلکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے متفقہ موقف کو ہی مدلل ومبرہن کیا ہے، انھوں نے نہ تو اُس طریق کو قبول کیا جو ماضی سے بالکل کٹا ہوا ہو اور نہ ہی تقلیدِ آبار میں بدعات وخرافات کو دین میں داخل کیا۔ علمائے دیوبند کے مختلف جیالوں نے مختلف موقعوں سے غیروں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنا صحیح اور دو ٹوک موقف امتِ مسلمہ کے سامنے رکھا ہے، اس سلسلے میں حضرت حکیم الاسلام، حضرت تھانوی، حضرت مدنی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہم اللہ خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

آج میرے سامنے جناب مولانا توحید عالم صاحب قاسمی بجنوری زید مجدہ کی کتاب: ''مسلکِ اہل السنۃ والجماعۃ یعنی علمائے دیوبند کے عقائد ونظریات'' ہے، اس میں علمائے دیوبند

کے چالیس عقائد ونظریات کو آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ، آثارِ صحابہ وتابعین اور عباراتِ اکابر سے مدلل ومُوثَّق کیا ہے، اور یہ ثابت کردکھایا ہے کہ عصرِ حاضر میں علمائے دیوبند ہی اہل السنۃ والجماعۃ کے صحیح ترین ترجمان ہیں، اس کتاب کی خوش قسمتی ہے کہ موضوع کے حسّاس ہونے کی وجہ سے چھ اکابر اساتذۂ دارالعلوم دیوبند نے اِسے اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے، اب قارئین کو علمائے دیوبند کے موقف کو سمجھنے کے لیے بڑی بڑی کتابوں کی ورق گردانی نہیں کرنی پڑے گی، کتب خانوں کی سیر سے اُن کو نجات مل گئی، کتاب میں ذکر کردہ چالیس عناوین میں سے ہر عنوان ایک مستقل موضوعِ کتاب ہے، مصنف زیدمجدہ نے اختصار کا خیال رکھا، اور ہر موضوع سے متعلق نہایت اہم اور بنیادی باتوں کو ذکر کیا ہے، کتاب کیا ہے؟ ''بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' کا نمونہ یا مضامین کے ''دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا کرشمہ'' یا کہیے ''گلہائے رنگا رنگ سے مزین گلدستہ''! قارئین پڑھیں اور لطف اٹھائیں! کتابت، طباعت، کاغذ اور ٹائٹل سب کچھ عمدہ اور سب سے عمدہ اس میں ذکر کردہ مُعَطَّر مضامین ہیں جو قارئین کے مَشامِ جاں کو معطر کرنے کے لیے کافی وافی ہیں۔ وباللہ التوفیق!

❁ ❁ ❁